www.urducouncil.nic.in

جنوری 2021، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

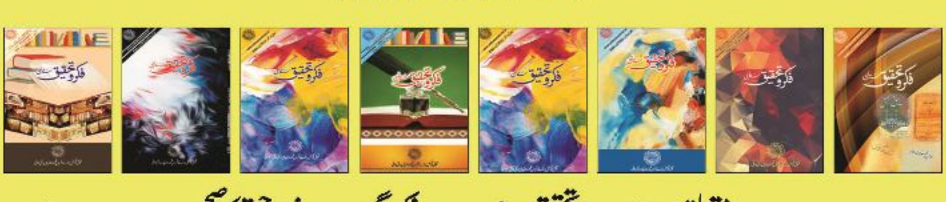

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com , sales@ncpul.in

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	مضامین	
26 جنوری کی اہمیت اور تاریخی پس منظر	خواجہ عبدالمنتقم	06
ڈاکٹر کلام کی مفکرانہ اور لازوال جھونپڑیاں	محمد قمر سلیم	08
موبائل :افادیت اور نقصانات	رومانہ پروین	10
سمندر کی شہزادی : گریس ڈارلنگ	اسما انصاری	13
	میرا بچپن	
یاد آرہا ہے مجھ کو بچپن کا وہ زمانہ!	قاضی مشتاق احمد	18
	نظمیں	
قدرت اور نعمتیں	خیال انصاری	22
نیٹ کا ہے زمانہ یہ بچو	محمد وکیل	23
کیا خوب ہیں نظارے چھبیس جنوری کے	محمد عادل فراز	24
لاک ڈاؤن اور ہم	الیاس احمد انصاری شاداب	25
چھوٹا سا ننھا سا پیارا سا بچہ	خطاب عالم شاذ	25
بلی رانی	رئیس ستارہ	26
بچے	کائنات خلیق	26
قدرت کے یہ نظارے	صبا منیر	27
	کہانیاں	
طوطے کے بچے	ذکیہ مشہدی	28
انصاف کا ناٹک	محمد طارق	31
دریچہ	پرویز احمد	34
اندھیروں کا چراغ	سمیہ فرحین	39
نام کا نام اور کام کا کام	عائشہ صدیقہ	42
جگر کی باتیں	فہیم ادیب فاروقی	45
	بچوں کے ادیب	
بابا سائیں شکیل الرحمن	ابرار احمد اجراوی	48
	بچوں کا کتب خانہ	
ریگ زاروں کے گلاب	عارف عثمانی	51
	صحت اطفال	
Covid-19 بچے اور نمونیا	بشریٰ اشرف	53
	اردو کا جادو	
اردو زبان کا جادو	ادارہ	57
	کہکشاں	
چمن چمن کے پھول		58
کامیابی بنی مقدر	خانسا کاشف	59
	ننھے فنکار	
بچوں کی پینٹنگ		62

بچوں کی دنیا

جلد: 9 شمارہ: 01 جنوری 2021

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: اجمل سعید

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

پیارے بچو! سب سے پہلے آپ لوگوں کو نئے سال اور یومِ جمہوریہ کی مبارکباد!

آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ ہم ہر سال 26 جنوری کو جشن یوم جمہوریہ مناتے ہیں کیونکہ یہ دن ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اسی دن ہمارے ملک میں آئینِ ہند کا مکمل طور پر نفاذ ہوا تھا۔ 26 جنوری ہو یا 15 اگست ہمارے لیے ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ہمارے بزرگوں نے آزادی اور آئین کے لیے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں، جیل کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ ایسے میں ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم

ان کے ذریعے حاصل کی ہوئی آزادی اور جمہوری اقدار کی قدر کریں، انھیں یاد کریں اور ملک کے لیے مخلص ہوں۔ ایسے کام کریں جن سے ہمارے ملک کا نام روشن ہو۔ اگر تمام لوگ ملک سے محبت کریں گے تو یقیناً ہمارے ملک سے بہت سی برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہر طرف محبت، اخوت، اتحاد و یکجہتی کا بول بالا ہوگا اور زندگی کے ہر شعبے میں ہمارا ملک تیزی سے ترقی کرتا نظر آئے گا۔

پیارے بچو! ہمارے لیے ایک اور خوشی کا موقع یہ ہے کہ ہم اب نئے سال 2021 میں داخل ہو رہے ہیں۔ نیا سال ہمارے لیے بہت سے خواب، نئی امیدیں اور نئے امکانات لے کر آتا ہے اور ہم پورے سال ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر ہم بہت سے منصوبے بھی بناتے ہیں، ہمارے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ کس طرح آنے والے سال کو اپنے لیے قیمتی بنایا جائے۔

آپ بھی اس موقعے پر نئے سال کے لیے منصوبہ بندی کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟ اور کیسے کرنا ہے؟ جو مضامین آپ اسکول یا مدرسے میں پڑھ رہے ہیں، ان کے علاوہ بھی کوئی اور مضمون آپ اپنے لیے منتخب کر سکتے ہیں، وہ موضوع تاریخ بھی ہو سکتا ہے، معلومات عامہ بھی ہے، پینٹنگ بھی ہے، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اپنی منصوبہ بندی میں کسی ہنر کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ لیکن نئے سال کے لیے کچھ دوسری چیزوں کا انتخاب کرتے وقت یہ بات دھیان میں رہے کہ اسکول کا کام متاثر نہ ہو۔ اس لیے کہ اسکولی تعلیم میں تسلسل بہت ضروری ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔ جو کچھ بھی نئے سال کے لیے پلان کرنا ہے، وہ فارغ وقت کے لیے کریں۔ آپ ابھی بچے ہیں لیکن کل آپ جوان ہوں گے اور پوری قوم و ملک کی ذمے داری آپ کے کندھوں پر ہوگی۔ اس لیے کیا ہی بہتر ہو کہ آپ پہلے سے ہی اس ذمے داری کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں اور جو صلاحیتیں قدرت نے آپ کے اندر رکھی ہیں، اس میں نکھار لائیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا اکتوبر کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا، ہمیشہ کی طرح خوبصورت سرورق پر مہینے کی مناسبت سے گاندھی جی کی دونوں تصویریں خوب ہیں۔ اس شمارے میں میری تحقیق 'گنبد کا جادو' بھی شامل اشاعت ہے جس کے لیے سراپا سپاس گزار ہوں۔ اداریے کے تحت آپ نے سرسید احمد خان اور مہاتما گاندھی دونوں عظیم ہستیوں کو سراہتے ہوئے عمدہ خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی تعلیمات پر عمل کی دعوت بھی دی جو لائق تحسین ہے۔ دیگر مشمولات میں کہانیاں بھی خوب ہیں۔ سائنس، صحت اور مختلف موضوعات پر مضامین جیسے 'کیوی پھل'، پریم چند اور بچے کی صحت مختصر مگر جامع مضامین ہیں۔

اگر مناسب سمجھیں تو 'زبان شناسی' جیسے بچوں اور بڑوں کے لیے اہم کالم کو مکمل صفحہ مختص کیا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی کارآمد ہے اس لیے ہم جیسے بچے بھی اس کے منتظر رہتے ہیں۔ اللہ اس رسالے کو نظر بد سے بچائے۔ الحمدللہ نومبر کا شمارہ بھی آج کی ڈاک سے مل گیا۔

رحیم رضا، بیاول، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' کا نومبر 2020 کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سب پہلے تو اس شمارہ کا ٹائیٹل مجھے متاثر کررہا ہے۔ ٹائیٹل پر جو تصویر شائع کی گئی ہے، اس میں ایک ماں اور بچے کو دکھایا گیا ہے۔ ماں اپنے بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہے، اور نہایت شفقت آمیز انداز میں اسے دیکھ رہی ہے، وہ بچے پر اس طرح توجہ دیے ہوئے ہے کہ اس سے ممتا جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گویا کہ اس کی کل کائنات وہی بچہ ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ماں اپنے بچوں کو کتنا پیار کرتی ہے۔ یہ تصویر اس بات کو واضح کرتی ہے کہ بچہ کی پرورش و پرداخت نہایت مشفق ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ تصویر اس بات کا پیغام بھی ہے کہ جس طرح مائیں پیار و شفقت کے ساتھ اپنے بچوں کو پالتی پوستی ہیں، وہ بھی بڑے ہو کر ان کا خیال رکھیں اور ان کی فرماں برداری کریں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ 'ماں' کسی بھی قیمت پر اپنے بچے کا برا نہیں چاہتی۔ اس کی محبت خالص ہوتی ہے، اس میں کسی طرح کا مفاد شامل نہیں ہوتا ہے۔ اگر بچے کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تڑپ اٹھتی ہے، اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی ہے، اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اپنی سی کوششیں کرتی ہے اور قدم قدم پر اس کی بہترین رہنمائی کرتی ہے۔ وہ بچے بہت خوش نصیب ہیں جن کی ماؤں کا سایہ دیر تک ان کے سروں پر رہتا ہے۔ میں ٹائیٹل کے لیے 'بچوں کی دنیا' کے ایڈیٹر، ڈیزائنر اور عملہ کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ٹائیٹل کی زینت اور معنویت کا بھرپور خیال رکھا۔ اس شمارے کے اندرونی صفحات بھی مزین ہوتے ہیں اور مضامین، نظموں اور کہانیوں کے ساتھ جو تصویریں لگائی جاتی ہیں، وہ بھی معنویت سے لبریز ہوتی ہیں۔ اس رسالہ کو طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے بھی معیاری کہا جاسکتا ہے اور مواد کے اعتبار سے بھی۔ رسالہ میں جو مواد شائع کیا جاتا ہے، اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس سے بچوں کی صحیح رہنمائی ہو اور وہ کسی نہ کسی صورت میں ان کے لیے مفید ثابت ہو۔ میں ایک بار پھر اس رسالہ کی بہتر انداز میں اشاعت کے لیے پورے اسٹاف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ابوحسان، محلہ مخدولہ ٹانڈہ رامپور یوپی، پن 244925

مضمون

26 جنوری کی اہمیت اور تاریخی پس منظر

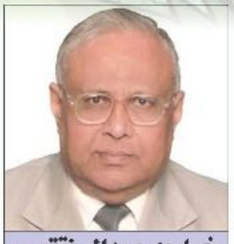
خواجہ عبدالمنتقم

خواجہ عبدالمنتقم قانونی موضوعات کے ماہر ہیں اور اس موضوع سے متعلق ان کی کئی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں 'بھارت کا آئین سہ لسانی ایڈیشن مع تاریخ، تنقید و تبصرہ' اہم ہے۔ اس کے علاوہ 'انسانی حقوق'، ہندوستانی نظامِ قانون' اور 'مجموعہ تعزیراتِ بھارت' سے متعلق کتابیں قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بچوں کے حقوق پر بھی بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ انسانی حقوق سے متعلق اپنی کتاب 'انسانی حقوق اور بچے کے عنوان' کے تحت بچوں کے حقوق سے متعلق ملکی و عالمی پیمانے پر کیے گئے اقدامات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

بچو! ہر سال 26 جنوری کو یوم جمہوریہ کے موقع پر دہلی میں انڈیا گیٹ کے پاس راج پتھ پر ایک بڑی تقریب ہوتی ہے جس میں ہمارے ملک کے صدر، وزیراعظم، دیگر وزرا اور عام طور پر ایک باہری مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اس تقریب میں ہمارے ملک کے راشٹر پتی کو، جو فوج کے سب سے بڑے کمانڈر یعنی سپریم کمانڈر ہیں، فوج سلامی دیتی ہے۔ یہیں سے پریڈ شروع ہوتی ہے اور لال قلعہ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس پریڈ میں ملک کی فوجی طاقت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ نئے نئے ہتھیار دکھائے جاتے ہیں۔ پریڈ میں شامل ہونے والی صوبوں کی جھانکیوں میں وہاں کی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ صرف دہلی ہی نہیں تمام ریاستوں میں گورنروں ولیفٹیننٹ گورنروں کو سلامی دی جاتی ہے۔ چاروں طرف جھنڈے ہی جھنڈے نظر آتے ہیں۔ آسمان میں پتنگیں اڑتی نظر آتی ہیں۔ اس طرح 26 جنوری کو ایک تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔

بچو! آپ 26 جنوری کو ہر سال تہوار کے طور پر مناتے ہو مگر کبھی آپ نے یہ سوچا یا جاننے کی کوشش کی کہ آخر یوم جمہوریہ کیوں منایا جاتا ہے۔ آیئے ہم آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ یوم جمہوریہ کیوں منایا جاتا ہے اور 26 جنوری کو ہی کیوں منایا جاتا ہے؟ 26 جنوری 1950 یعنی یوم جمہوریہ وہ مبارک دن ہے جس دن ہندوستان کا آئین مکمل طور پر نافذ ہوا تھا اور اس نے انگریزوں کی حکومت کے دوران بنائے گئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935 کی جگہ لی تھی۔ 26 نومبر، 1949 کو ہماری آئین ساز اسمبلی نے آئین کے جس متن کو منظوری دی تھی یا بالفاظ دیگر Adopt کیا تھا وہ 26 جنوری، 1950 کو نافذ ہوا اور اسی

مضمون

کے ساتھ ہمارے ملک میں جمہوریت کی بنیاد پڑی لیکن اگر ہم صحیح معنوں میں پارلیمانی جمہوریت کے آغاز کی بات کریں تو یہ 13 مئی، 1952 کو ہوا یعنی اس دن جب ہندوستان کی پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ اس دن ہر سال حکومت اس بات کو دہراتی ہے اور عوام بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام شہریوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف ملے گا، انھیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے، اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی مکمل آزادی ہوگی، سب کو روزگار کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے اور فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کو یقینی بنانے والی اخوت کو فروغ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مملکت ایسا سماجی نظام قائم کرے گی کہ جس میں قومی زندگی کے سب ادارے عوام کے ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کریں اور لوگوں کی بھلائی کے کام کریں۔

آیئے اب 26 جنوری کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، 26 جنوری 1950 یعنی یوم جمہوریہ وہ دن ہے جس دن ہندوستان کا آئین مکمل طور پر نافذ ہوا تھا۔ یہاں ہم نے لفظ 'مکمل' کا استعمال اس لیے کیا ہے کہ ہماری آئین ساز اسمبلی اس آئین کو 26 نومبر 1949 کو پہلے ہی Adopt کر چکی تھی یعنی خود پر نافذ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دفعات 5، 6، 7، 8، 9، 60، 324، 366، 367، 379، 380، 388، 391، 392 اور 393، 26 نومبر کو ہی لاگو ہو چکی تھیں۔ اب آپ یہ پوچھیں گے کہ آئین کے نفاذ کے لیے 26 جنوری کی تاریخ کا ہی کیوں انتخاب کیا گیا؟ داصل 26 جنوری، 1929 کو ہی اس وقت کی انڈین نیشنل کانگریس نے لاہور میں، جواب پاکستان کا ایک اہم شہر ہے، مکمل سوراج یعنی اپنی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

آیئے بچو! اب ہم آپ کو ایک ایسی بات بتاتے ہیں جو اس وقت آپ کے بڑوں کے اور بڑے ہو کر آپ کے کام آئے گی۔ 26 جنوری کی نہ صرف تاریخی اہمیت ہے بلکہ قانونی اعتبار سے بھی یہ دن کافی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دن کو پورے ملک میں NegotiableInstruments Act کے تحت یعنی دستاویزات خرید وفروخت، چیک وغیرہ سے متعلق قانون کے تحت لازمی عام چھٹی کا درجہ حاصل ہے۔ اس قانون کے تحت اگر کسی دن کو تعطیل یعنی چھٹی کا درجہ دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی قانونی عمل اس دن تک کیا جانا ہے تو یہ دن اس کی میعاد میں شامل نہیں ہوتا اور اس عمل کو اس تعطیل کے اگلے دن انجام دیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے اگر کوئی درخواست دینے کی آخری تاریخ 26 جنوری 2021 ہے مگر 26 جنوری کو چونکہ اس قانون کے تحت تعطیل قرار دی گئی ہے اس لیے وہ درخواست 27 جنوری 2021 تک دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح کوئی پرونوٹ (promissory note)، یا Bill of exchange یا ہنڈی اس تاریخ تک valid یعنی قابل قبول ہے تو اسے اگلے دن تک وہی قانونی حیثیت حاصل رہے گی یعنی اسے 27 جنوری کو پیش کیا جا سکتا ہے یا کسی دستاویز کی عمل درآمدگی کی آخری تاریخ 26 جنوری ہے تو وہ خود بخود 27 جنوری ہو جائے گی کیونکہ 26 جنوری کو اس پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اول تو کسی بھی دستاویز کو تحریری شکل دیتے وقت اس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی بھول بھی ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں عمل آوری کے اس صول کو اپنایا جاسکتا ہے۔

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharama Apts.
2, I.P. Extension
Delhi - 110092, Mob.: 9818369624

مضمون

ڈاکٹر کلام کی مفکرانہ اورلازوال جھونپڑیاں

محمد قمر سلیم

ڈاکٹر محمد قمر سلیم اردو کے معروف قلمکار اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے جہاں بڑوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھی ہیں وہیں بچوں کے لیے درسی اور غیردرسی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ این سی ای آر ٹی سے ان کی سات کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں بارھویں جماعت کے لیے 'دھنک' اور 'نئی آواز' شامل ہیں۔ بچوں کے رسائل ماھنامہ 'امنگ' نئی دھلی، 'بچوں کی نرالی دنیا' دھلی 'گل بوٹے' ممبئی، 'روشن ستارے' حیدرآباد اور 'بچوں کی دنیا' نئی دھلی میں ان کی بہت سی تحریریں شائع ہوچکی ہیں۔

بچو! سن کر کچھ عجیب سا لگتا ہے نا، ڈاکٹر کلام کی مفکرانہ اورلازوال جھونپڑیاں۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے سنہ 2000 سے سنہ 2007 تک ہندوستان کے گیارہویں صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر کلام سے بہت سے دلچسپ واقعات منسوب ہیں۔ انھیں عوام کا صدر کہا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ عام لوگوں سے اور خاص طور سے بچوں اور طلبا سے بہت محبت کرتے تھے اور ان میں گھل مل جاتے تھے۔ وہ ایک غریب گھر کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے بچپن میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے اخبارات فروخت کیے۔ ان کے والد مسجد کے امام تھے اور ان کے روزگار کا سہارا ایک کشتی تھی۔ ڈاکٹر کلام کو پڑھنے کا ایسا جنون تھا کہ ان کی غربت بھی اس میں رکاوٹ نہیں بن سکی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سائنس کی دنیا میں ایسا نام کمایا کہ 'میزائل مین' بن گئے اور ہندوستان کو بلندیوں پر پہنچایا۔ اتنے عظیم انسان ہونے کے بعد بھی انھوں نے بہت سادہ زندگی گزاری۔ ان کے پاس ایک سوٹ کیس تھا جس میں دو تین جوڑی کپڑے رہتے تھے، ساتھ میں ایک لیپ ٹاپ، ایک سی ڈی پلییَر، ایک 'وینا' اور کتابیں۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ صدر بننے کے بعد وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ ایک ٹرسٹ کو عطیہ میں دے دیتے تھے۔ یہ ان کی بلندی کی انتہا اور طلبا سے محبت ہی تھی کہ ان کی پیدائش کے دن ،15/اکتوبر کو یو این او نے 'ورلڈ اسٹوڈینٹس ڈے یعنی عالمی طلبادن' کی شکل میں منانے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر کلام دنیا بھر میں اتنے مقبول تھے کہ انھیں 40 یونیورٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں ملیں یہی نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ نے 26 مئی کو سائنس ڈے کے طور پر منانا شروع کردیا کیوں کہ اسی تاریخ کو ڈاکٹر کلام سوئٹزرلینڈ گئے تھے۔

ڈاکٹر کلام کو درس و تدریس کا بے پناہ شوق تھا۔ وہ اپنے اساتذہ کی بہت عزت کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ اپنے آپ کو کیا کہلانا پسند کریں گے۔ ہندوستان کا صدر، مصنف، سائنس داں، میزائل مین، ہندوستان 2020 یا ٹارگیٹ 3 بلین۔ اس پر انھوں کہا، 'میں معلم کہلانا پسند کروں گا۔'

ارے میں ڈاکٹر کلام کی خوبیاں بیان کرنے میں اتنا مگن ہوگیا کہ ان کی مفکرانہ اور لازوال جھونپڑیوں کے بارے میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ ڈاکٹر کلام نے تقریباً 25 کتابیں لکھیں (حالانکہ صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے)۔ ان کا زیادہ تر وقت پڑھنے، لکھنے، لیکچر دینے اور تحقیق کرنے میں گزرتا تھا اسی لیے وہ بہت سوچتے تھے۔ راشٹر پتی بھون پہنچنے کے بعد ایک دن وہ مغل گارڈن کی سیر کر رہے تھے کہ ان کے ذہن میں جھونپڑیوں کا خیال آیا تو انھوں نے راشٹر پتی بھون کے مغل گارڈن کے مرکزی لان میں برگد کے پیڑ کے نیچے منی پوری طرز کی دو جھونپڑیاں تعمیر کروائیں جنھیں تریپورا کے فنکاروں نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں سے ایک جھونپڑی 'تھِنکِنگ ہَٹ یا مفکرانہ جھونپڑی' کہلاتی تھی جبکہ دوسری 'اِم مورٹَل ہَٹ یا لازوال جھونپڑی' کہلاتی تھی۔

ڈاکٹر کلام اپنی ان جھونپڑیوں کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''یہ میرے، فطرت اور ملک کے شہریوں کے مابین تبادلۂ خیال کا ایک زبردست ذریعہ تھیں۔ ایسی جگہ جہاں میں جڑی بوٹیوں کے ماہرین سمیت متعدد شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملا۔''

ڈاکٹر کلام کی لازوال جھونپڑی کے چاروں طرف 16 درخت تھے، ایک جڑی بوٹیوں کا پارک تھا جس میں 34 قسم کی جڑی بوٹیوں کے نباتات، ایک میوزیکل گارڈن تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس جھونپڑی میں بیٹھ کر میں ایسا محسوس کرتا تھا جیسے میرے اندر کوئی چیز ہے اور وہ لازوال ہے۔ ڈاکٹر کلام کہتے ہیں میں ان جھونپڑیوں میں بیٹھتا تھا، سوچتا تھا، پیچیدہ فیصلے کرتا تھا۔ ان جھونپڑیوں کے صوفوں پر بیٹھ کر ہی ہم اپنے دوستوں، شاگردوں کے ساتھ بحث کرتے تھے، خیالات کا اظہار کرتے تھے اور کسی بھی موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اس کے نتیجے میں ہی ان کی دو اہم کتابیں وجود میں آئیں۔ ایک کتاب 'ٹَرننگ پوائنٹ: اے جَرنی تھرو چیلینجز' تھی اور دوسری کتاب 'گائیڈِنگ سول: ڈائلاگ آن دی پَرپَز آف لائف' تھی۔

راشٹر پتی بھون کے ایک ترجمان نے بتایا تھا کہ جب صدر ڈاکٹر کلام خود شناسی کے موڈ میں ہوتے تھے تو جھونپڑی کا استعمال کرتے تھے۔ چاندنی رات میں یہ جھونپڑی بہترین ماحول پیش کرتی تھی ایسے میں ان کے ساتھ ان کا لیپ ٹاپ ہوتا تھا، وہ یہاں بیٹھ کر نظمیں بھی لکھتے تھے۔ انھوں نے جھونپڑی کو 'صحیح سوچ والے شہریوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا، ''یہ جھونپڑی صحیح سوچ اور نیک لوگوں کے لیے ہے۔''

لیکن افسوس راشٹر پتی بھون چھوڑنے کے بعد ان کی ان جھونپڑیوں کو یہ کہہ کر مسمار کر دیا گیا کہ یہ راشٹر پتی بھون میں آنکھوں کو بری لگنے والی چیز ہے۔ 27/جولائی 2015 کو وہ اپنے سب سے خوبصورت مشغلے یعنی طلبا سے 'زمین کو ایک رہائشی سیارہ بنانا' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے گر پڑے اور اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

■

Mohd Qamar Saleem
Flat No:3, Atma Shanti
Co-Operative Housing Society
Plot No.: 33, Sector: 3, Washi
Navi Mumbai - 400703 (Maharashtra)
Mob.: 9322645061

رومانہ پروین

موبائل: افادیت اور نقصانات

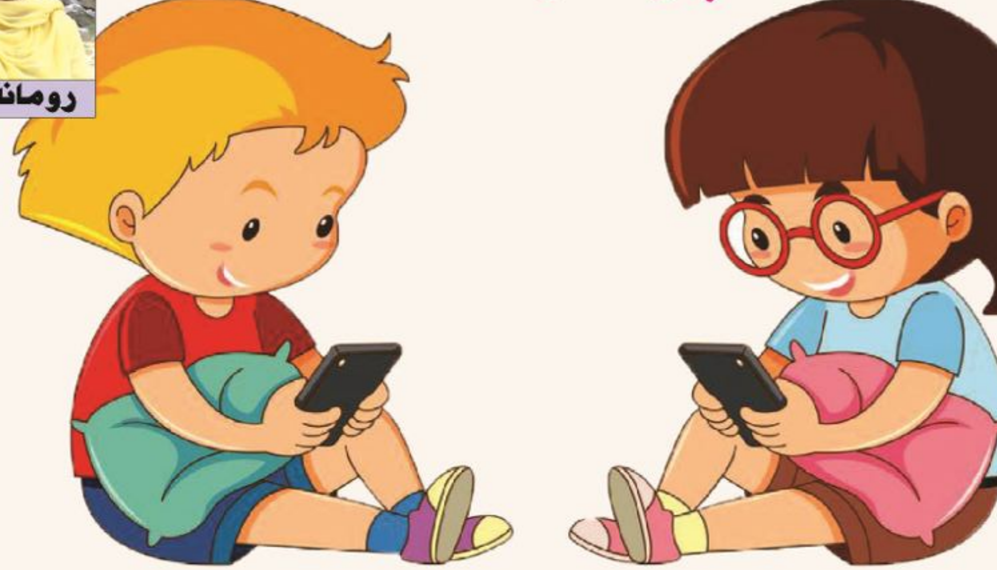

بچو ! دورِ حاضر میں موبائل انسانی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کیمبرج ڈکشنری میں اس طرح ہیں:

"Moving or walking around freely."

(ترجمہ: ’’آسانی سے کھسکایا یا کہیں بھی لے جایا جائے!‘‘)

موبائل کے موجد مارٹن کوپر(Martin Cooper) نے بھی یہ Gadget ایجاد کرتے وقت نہ سوچا ہوگا کہ یہ انسان کی زندگی میں، اس کی روح کے بعد ایک اہم مقام حاصل کرلے گا۔ آج ہم موبائل کو جس شکل میں دیکھ رہے ہیں، ایجاد کے وقت اس کی صورت ایسی نہیں تھی اور نہ ہی اسے موبائل کہا جاتا تھا۔ اس کا نام پہلے پہل Hand Cellular Mobile Phone تھا۔ Airicom نامی کمپنی کے بانی اور C.E.O. اور امریکی شہری مارٹن کوپر جو کہ 26/دسمبر 1928 کو شکاگو میں پیدا ہوئے تھے، اس سیلولر موبائل کے بانی تھے۔ وہ مشہور موبائل کمپنی Motorola کے ملازم تھے۔

آج کا موبائل ملٹی میڈیا یا اسمارٹ فون کہلاتا ہے لیکن پہلے اسے صرف موبائل ہی کہا جاتا تھا۔ وقت اور ضرورت کے اعتبار سے موبائل کی صورت میں نت نئی تبدیلیاں آتی گئیں۔ بٹن سے Touch میں تبدیل ہوگیا۔ پہلے نمبر ڈائیل کرنے کے لیے بٹن دبانے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن اب نمبروں پر انگلی مس کرتے ہی نمبر ڈائل ہوجاتا ہے یا میسیج ٹائپ ہوجاتا ہے۔ پہلے کے موبائل میں انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی۔ صرف کال آتی جاتی تھی اور میسیج بھیجا جاسکتا تھا۔ لیکن اسمارٹ فون نے لوگوں کی زندگی بڑی آسان بنا دی۔ پیغامات ہوں یا ای میل، تصویریں ہوں یا کوئی دستاویز..... ہر چیز بآسانی موبائیل میں انٹرنیٹ کی سہولت سے بذریعہ ای میل ہم کسی کو بھی بھیج سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ریلائنس ٹیلی کام کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے سماج کے ہر طبقے تک موبائیل ہینڈ سیٹ کو پہنچا دیا۔ دھیرو بھائی امبانی کی اس ریلائنس کمپنی نے 28/دسمبر 2002

کو پہلا انتہائی کم قیمت یعنی پانچ سو روپے والا موبائل ہینڈ سیٹ ہندوستان میں لانچ کیا اور اس ہینڈ سیٹ نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے بڑی تگ و دو کی اور متوسط طبقے سے لے کر غریب طبقے تک کے لوگوں کے ہاتھوں میں محض پانچ سو روپے میں موبائل پہنچ گیا۔ جب اسمارٹ فون مارکٹ میں آ گیا اور نیٹ کی سہولت اس میں دستیاب ہو گئی تو لوگ ماہانہ اچھے خاصے روپے خرچ کرنے لگے۔ پانچ سو سے لے کر ہزار تک ماہانہ ریچارج نے غریبوں کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں، تب JIO نے سہولت پیدا کی اور کال کی شرح اور انٹرنیٹ کی شرح میں انتہائی حد تک کمی آ گئی۔ اب تو یہ حال ہے کہ سو میں سے 95/ فیصد لوگوں کے موبائل میں کوئی اور سم ہو یا نہ ہو، جیو کی سم ضرور ہے۔ ان باتوں کو تفصیل سے بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ موبائل نے بھی ہم انسانوں کی طرح اپنی زندگی میں اُتار چڑھاؤ کو دیکھا ہے۔

سائنس کی ترقی دراصل سماج اور سماج کے لوگوں کی ترقی ہے۔ سائنس جب بھی کسی نئی چیز یا آلے کی ایجاد کرتی ہے تو اس کا مقصد فلاح انسانی ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہم لوگ اس آلے سے ایسے کام لینے لگتے ہیں جو ہمارے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ موبائل کا بھی یہی حال ہے۔ یوں تو موبائل کے اَن گنت فائدے ہیں، جن سے ہم اور آپ مستفید ہو رہے ہیں لیکن وہیں اس کا غلط استعمال بھی خواب ہو رہا ہے۔ موبائل کے رعایتی قیمتوں پر دستیاب ہونے کی وجہ سے یہ ہر گھر اور ہر گھر کے فرد کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس کا استعمال انسان کی عمر کا متقاضی نہیں رہا۔ عمر دراز سے لے کر جوان اور جوان سے لے کر بچوں تک کے ہاتھوں میں آج آپ موبائل دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارا اور آپ کا گھر بھی یقیناً اس میں شامل ہے۔ بچو! آپ کو اس کے مضر اثرات سے بچنا ہے۔ طلبا کا تو یہ حال ہے وہ آج اسکولوں اور کالجوں میں بھی موبائل ساتھ رکھتے ہیں اور جہاں ذرا سی فرصت ملی، موبائل میں لگ جاتے ہیں۔ نوجوانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو سارا سارا دن سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس Visit کرتا ہے۔ فیس بک پر نت نئے دوست بنانے کی تو ایک وبا سی پھیل چکی ہے۔ انسان کے گھر میں خانہ جنگی چل رہی ہے۔ اپنے اپنوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں، رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے، رشتے داروں کے درمیان خلا پیدا ہوتا جا رہا ہے لیکن نئی نسل ان سب باتوں سے بے پروا ہو کر کسی اور ہی دنیا کی سیر کر رہی ہے۔

امسال مارچ کے مہینے سے پوری دنیا بالخصوص ہمارا ملک ہندوستان ’کرونا‘ کی لپیٹ میں آ گیا اور اب تک ہم اس بیماری کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایک سے دوسرے میں انتہائی سرعت کے ساتھ پھیلنے والی اس بیماری کی روک تھام کے لیے حکومت نے ’لاک ڈاؤن‘ کا اعلان کر دیا جس سے ہمارے ملک کے شب و روز تھم گئے۔ دکانیں بند، لوگوں کی ملاقاتیں بند، کاروباری اور دفتری نظام ٹھپ پڑ گیا۔ تعلیم گاہوں یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں بھی جانے سے منع کیا گیا۔ لیکن انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ بڑے سے بڑے چیلنجز کا وہ سامنا کر سکتا ہے۔ یہ کرونا مہاماری کے دور میں ثابت ہو گیا۔ بھلے چند دنوں کے لیے زندگی تھم یا ٹھہر گئی لیکن انسان نے ان حالات میں بھی اپنے آپ کو ہر سطح پر مستحکم کر لیا۔ ایسے میں موبائل نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اس موبائل نے تعلیمی نظام کو بحال کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ بھلے ہی اسکول یا کالج بند ہیں۔ عملی طور پر کلاسیز آف ہیں لیکن موبائل کے

ذریعے کلاس لینے کا سلسلہ بڑے زور وشور اور کامیابی سے چل رہا ہے۔ موبائل نے اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی سطح کے ٹھپ تعلیمی نظام کو بحال کردیا۔ اساتذہ چاہے وہ کسی بھی تعلیمی ادارے کے ہوں، موبائل پر ان دنوں پابندی سے کلاس لے رہے ہیں۔ Google Meet،Zoom اور Telegram جیسے سوشل پلیٹ فارم پر روزانہ کلاسیں جاری ہیں۔ اگر موبائل کی سہولت نہ ہوتی تو شاید ہمارا تعلیمی سلسلہ اب تک منقطع ہی رہتا۔ اب اس سے بڑا موبائل کا مثبت استعمال بھلا کیا ہوسکتا ہے۔ طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے لیے ضروری کورسیز بھی آن لائن موبائل پر جاری ہیں۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ کاروباری نظام بھی موبائل کے ذریعے بحال ہوگیا۔ آن لائن سامانوں کے آرڈر جاری ہونے لگے اور مختلف شاپنگ سائٹس نے عوام تک ان کی ضرورت کے سامان پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اگر ادب کی بات کریں تو جہاں ہم کسی مخصوص موضوع پر لوگوں کو اکٹھا کر کے پروگرام کا انعقاد کرتے تھے، جسے 'سمینار' کہا جاتا تھا، اس لاک ڈاؤن کے حالات میں وہ موبائل پر 'ویبینار' کی شکل میں روز منعقد ہورہے ہیں۔ اب شعروشاعری سے شغف رکھنے والوں کے لیے 'آن لائن مشاعرے' زور وشور سے ہورہے ہیں اور لوگ موبائل پر ہی ویبینار اور مشاعرے جیسے ادبی پروگراموں سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔

بچو! ہمیں اور آپ کو موبائیل کے بے جا استعمال سے پہلے خود کو بچانا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم بہت جلد کسی چیز کے عادی ہوجاتے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اگر بُری عادتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا اٹل ارادہ کرلیں تو کوئی مشکل نہیں۔ انسان کی زندگی میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیے اور سائنس کی عطا کردہ انمول شے یعنی موبائل کا خود بھی صحیح استعمال کرنا چاہیے اور دوسروں کو بھی وقت کی اہمیت اور موبائل کے مثبت اور منفی دونوں اثرات سے واقف کرانا چاہیے۔ بھلے ہی یہ بات کہنے میں بہت آسان لگ رہی ہے لیکن اگر صدق دل سے اس پر عمل کیا جائے تو یقیناً ہم اپنی نسل کو بہت سی بُرائیوں سے بچا سکتے ہیں۔

■

Rumana Parveen
C/o Md. Bablu
84/11, Narkeldanga North Road
Kolkata - 700011(West Bengal)
Mobile : 8777262912،9331822945

اسما انصاری

سمندر کی شہزادی: گریس ڈارلنگ

لائٹ ہاؤس، روشنی کے مینار یا مینارۂ نور کی اصطلاح جہاز رانی سے منسوب ہے۔ لائٹ ہاؤس ایک بلند مینار یا برج نما عمارت ہوتی ہے جس کے اوپری حصے میں لگی ہوئی روشنیوں کے ذریعے سمندروں میں جہازوں کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ جدید ریڈیو ٹیکنالوجی سے پہلے جب جی پی ایس یعنی (Global Positioning System) متعارف نہ ہوا تھا بحری جہازوں کی آمد و رفت کے لیے، خشکی اور تری کی نشان دہی میں معاونت کرنے کے لیے لائٹ ہاؤس بنائے جاتے تھے۔ تاکہ ان کی مدد سے سمندر پر اپنے مقام کا علم ہو سکے اور خطرناک چٹانیں اور پتھریلے علاقوں سے بچا جا سکے۔ رات کے وقت یا دن میں جب مطلع ابر آلود ہو اور جگہ کی نشاندہی میں دشواری ہو تو ایسے وقت میں مینارۂ نور معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے متعین مقامات پر اونچے مینار بنا کر بالائی حصے میں تیز روشنی کی جاتی ہے۔ ان میناروں میں سرکاری طور پر مقرر کردہ افراد مع اپنے خاندان کے رہائش پذیر ہوتے تھے جو ان میناروں کی دیکھ بھال کرتے اور خدمات انجام دیتے تھے۔ حالانکہ یہ طریقۂ رہنمائی آج بھی رائج ہے۔

انگلینڈ کے چٹانی ساحل کے آس پاس ایسے بہت سارے مینارۂ نور کھڑے ہیں۔ یہ کہانی ہے ایک بہادر لڑکی کی جس نے اپنی ساری زندگی شہروں سے دور، انسانی آبادیوں سے دور، سمندر کنارے کھڑے تن تنہا میناروں میں اپنے خاندان کے ساتھ گزاری تھی۔ اس کا نام تھا ’گریس ڈارلنگ‘۔ وہ ایک لائٹ ہاؤس نگراں کی بیٹی تھی جو مختلف میناروں میں رہتے چلے آ رہے تھے کہ یہی ان کا آبائی پیشہ تھا۔ گریس نے اپنے والد کے ساتھ مل کر 1838 میں اپنی جان پر کھیل کر ایک تباہ شدہ جہاز کے مسافروں کو بچایا تھا۔ آئیے جانتے ہیں کہ آج 180 سال سے بھی زیادہ عرصہ بیتنے کے بعد ہم اس کی کہانی کیوں سنا رہے ہیں۔

مضمون

ولیم ڈارلنگ ایک لائٹ ہاؤس کیپر تھے۔ وہ انگلینڈ کے شمالی مشرقی حصے میں واقع ایک ساحلی گاؤں بامبرگ (Bamburgh) میں رہتے تھے۔ گریس ڈارلنگ کی پیدائش 24 نومبر 1815 کو بامبرگ میں اس کے دادا کے گھر ہوئی۔ وہ ولیم ڈارلنگ اور مسز تھامسن ڈارلنگ کی نو اولادوں میں ساتویں نمبر پہ تھی۔ ابھی گریس کی عمر چند ہفتے ہی ہوئی تھی کہ اس کے والد کی ملازمت براؤنس میں جزیرے کے لائٹ ہاؤس میں ہوگئی اور ان کا پورا کنبہ وہاں منتقل ہوگیا۔ جب گریس دس سال کی ہوئی تو کنبہ لانگ اسٹون لائٹ ہاؤس میں رہائش پذیر ہوگیا۔ ان کا نیا گھر انگلینڈ کے مشرقی ساحل کے قریب، ایک غیر آباد جزیرہ نما معلوم ہوتا تھا۔ ان کے گھر یعنی لانگ اسٹون لائٹ ہاؤس قریب کوئی گاؤں بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کا قریبی پڑوسی گاؤں بھی ان سے کئی میل دور واقع تھا۔ یہاں گریس اور اس کے بہن بھائی بڑے ہوئے۔ گریس کے والد ایک عقلمند اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے بہت دھیان و توجہ سے اپنے بچوں کی پرورش کی اور انھیں پڑھنا، لکھنا سکھایا تھا۔ پڑھانے لکھانے کے علاوہ انھوں نے اپنے بچوں کی اخلاقی تربیت بھی بہت اچھے طریقے سے کی تھی۔ انھوں نے بچوں کو ایماندار، بہادر، بے لوث اور مخلص ہونا بھی سکھایا تھا۔ جیسے جیسے گریس اور اس کے بہن بھائی بڑے ہوتے گئے وہ ایک ایک کر کے لائٹ ہاؤس چھوڑ کر شہروں میں چلے گئے۔ کوئی پڑھائی کے سلسلے میں، کوئی کام دھندے کے سلسلے میں آخر میں گریس کے علاوہ سبھی نے لائٹ ہاؤس چھوڑ دیا۔ گریس اپنے ماں اور باپ کی مدد کے لیے ان کے پاس ہی رہ گئی۔ وہ ایک نرم دل، حساس اور خاموش طبع شرمیلی لڑکی تھی۔ اس کا قد بھی زیادہ لمبا نہیں تھا۔ وہ صرف ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ وہ اپنے والد کی طرح بالکل نہیں تھی کہ جن کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبا تھا۔

گریس جب 22 سال کی ہوئی تو ایک رات سمندر میں آئے طوفان نے اس کی زندگی بدل دی۔ 6 ستمبر 1838 کی رات ایک خوفناک طوفان چل رہا تھا۔ گریس ایسے طوفانوں کی عادی تھی۔ وہ خود تو مینارۂ نور میں گرم بستر میں محفوظ رہتی تھی لیکن وہ ان غریب ملاحوں و مسافروں کے لیے ہمیشہ اداس ہوجایا کرتی تھی جو طوفان میں پھنسے ہوتے تھے۔ وہ ان کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔

6 ستمبر 1836 کی رات گریس نہیں جانتی تھی کہ آج رات ایک خوفناک حادثہ ہونے جا رہا ہے۔ خطرناک طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور زوردار بارش بھی ہو رہی تھی۔ سمندر کی لہریں پہاڑوں کی اونچائی تک اٹھ رہی تھیں۔ بجلیاں کڑک رہی تھیں اور بلا کا شور بپا تھا کہ آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ گریس اور اس کے والدین اپنے مینارۂ نور میں محفوظ تھے وہ لوگ اس طوفان کے ٹلنے کی دعائیں کر رہے تھے لیکن بپھرے ہوئے سمندر میں سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

اسی رات کو فورفشائر (Forfarshire) نامی بھاپ سے چلنے والا ایک جہاز یارکشائر (Yorkshire) کے ہُل (Hull) نامی مقام سے نکل کر اسکاٹ لینڈ کے ڈنڈی (Dundee) جا رہا تھا۔ شدید طوفان میں جہاز کے انجن ناکام ہوگئے اور جہاز میں موجود 60 کے قریب عملہ اور مسافر خطرے میں پڑ گئے۔ کپتان پناہ گاہ کی تلاش میں تھا کہ اسے لانگ اسٹون مینارۂ نور کی روشنیاں نظر آئیں۔ کپتان بڑی مشکل سے جہاز کو مینارۂ نور کے قریب لا رہا تھا۔ اس امید پر کہ شاید وہاں سے کچھ مدد مل سکے۔ لیکن بپھری ہوئی موجوں اور ہواؤں نے جہاز کا رخ بدل دیا اور جہاز پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ درجنوں مرد، خواتین اور بچے سمندر کا لقمہ بن

گئے۔ بعض افراد کو تو اپنے کیبن سے نکلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ نو دس افراد بڑی مشکل سے جہاز پر موجود لائف بوٹ میں سوار ہوئے لیکن طوفانی لہریں انھیں اپنے ساتھ بہا لے گئیں اور وہ لوگ بڑی مشکل سے ایک چٹان پر چڑھ سکے تھے۔ ہوا کے زور سے وہ بھی اڑے جا رہے تھے لیکن بڑی مشکل سے وہ ننگی چٹان کو اپنے ہاتھوں سے تھامے ہوئے تقریباً آدھے آدھے سمندر میں لٹکے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مینارۂ نور سے تقریباً 1 میل دور تھے۔ وہاں سے انھیں مینارۂ نور کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ لوگ مدد کے لیے بے تحاشہ چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے لیکن یقیناً ان کی چیخ و پکار مینارۂ نور تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ ہوا اور پانی کے شور کے درمیان گریس اور اس کے والدین ان کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ وہ بے چارے رات بھر اس طوفان میں پھنسے رہے اور ننگی چٹان پکڑے ہوئے لٹکے رہے۔

اگلی صبح چھ بجے گریس لباس تبدیل کر رہی تھی۔ اس کا کمرہ اوپری منزل پر تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سمندر میں طوفان ابھی بھی جاری تھا۔ اچانک وہ رک گئی کہ اسے سمندر میں کچھ نظر آ رہا تھا۔ جہاز کے باقی ماندہ تختے، کرسیاں وغیرہ اور چٹان پکڑ کر لٹکے ہوئے چند افراد۔ اس نے اپنے والد کو پکارا 'بابا، دیکھیے وہاں چٹانوں پر کچھ لوگ نظر آ رہے ہیں۔' ولیم ڈارلنگ دوڑتے ہوئے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ چٹانوں سے چمٹے ہوئے تھے لیکن وہ آدھے آدھے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''اس سے پہلے کہ وہ لوگ ڈوب جائیں ہمیں انھیں بچانا چاہیے بابا، ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے'' گریس چلائی ''بابا! اگر وہ لوگ مر گئے تو کیا آپ کو راتوں کو نیند آیا کرے گی؟ کیا آپ دوبارہ سکون سے رہ پائیں گے بابا؟ بتائیں نا بابا؟'' گریس اپنے والد سے سوال کر رہی تھی۔ ولیم ڈارلنگ ایک بہادر آدمی تھے لیکن ان کی اب عمر ہو چلی تھی۔ انھوں نے ناامیدی سے سر ہلایا اور بولے ''یہ تقریباً ناممکن ہے'' بیٹی ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ بھلا ان طوفانی لہروں میں میں کس طرح کشتی چلا سکتا ہوں؟ کاش میرے ساتھ کوئی توانا مرد ہوتا جو میری مدد کرتا۔'' ولیم نے ٹھنڈی سانسیں بھر کر کہا ''کشتی کے پتوار (چپّو) چلانے کے لیے کافی طاقت و قوت درکار ہو گی بیٹی۔''

''میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں بابا!'' میں بالکل کسی مرد کی طرح پتوار چلا سکتی ہوں۔ میں کشتی چلا سکتی ہوں بابا۔ کیا میں نہیں کر سکتی؟ میں چھوٹی ضرور ہوں لیکن کمزور نہیں اور آپ کے ساتھ تو میں اکثر کشتی چلاتی رہتی ہوں نا۔ ہم ان بدقسمت لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں اور انھیں بچا سکتے ہیں۔'' گریس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ بس بابا آپ تھوڑی سی ہمت کیجیے۔ گریس کی والدہ تھامسن ڈارلنگ بھی اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ کھڑکی پر کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ 'نہیں، نہیں' اس نے حیرت سے کہا، نہیں آپ ایسے شدید طوفان میں کشتی نہیں چلا سکتے۔ ایسے شدید طوفان میں تو مرد بھی ہار مان لیتے ہیں پھر تم تو ایک کمزور سی لڑکی ہو۔ گریس بیٹی خود کو آزمائش میں نہ ڈالو۔ اگر تم لوگ ڈوب گئے تو کیا ہوگا؟ ہمیں ان کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ شاید خدا ان کی مدد کرے لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے گریس بولی، لیکن ماں، ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کی والدہ انکار کرتی رہی۔

گریس اپنے والدین سے بحث کرتی رہی اور انھیں جہاز کے تباہ حال مسافروں کی مدد کرنے کے لیے منوا لیا۔ اس کے والد نے اس سے اتفاق کیا۔ مجبوراً اس کی والدہ کو بھی بھاری دل سے اجازت دینی پڑی۔ کشتی، پتواریں وغیرہ

نکالنے میں ان کی مدد کی۔ گریس اور اس کے والد چٹان کی جانب روانہ ہوئے۔ جب تک وہ لوگ نظر آتے رہے مسز ڈارلنگ انھیں دیکھتی رہی اور ان کے لیے دعا کرتی رہی۔

کوئی بھی شخص جس نے سمندری طوفان دیکھا ہو وہ تصور کرسکتا ہے کہ کشتی کیسے لہروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی ہے۔ یہ کشتی بپھرے ہوئے سمندر میں ایک تنکے کی مانند تھی اور لہروں کے زور سے بے تحاشہ ڈول رہی تھی۔ کبھی یہ اونچی لہروں کے ساتھ اوپر چلی جاتی تو لگتا کہ یہ ابھی الٹ جائے گی اور جب لہروں کے ساتھ نیچے آتی تو یوں لگتا کہ یہ ابھی ڈوب جائے گی۔ لیکن اس خطرناک ماحول میں بھی گریس بڑی مستعدی اور تندہی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر قوت صرف کر کے پتوار چلا رہی تھی جو کہ جسامت میں اس سے بھی بڑے تھے۔ ہوا اور بارش اتنی تیز تھی کہ گریس کو چٹان سے چمٹے ہوئے مرد و عورتیں نظر نہیں آ رہے تھے اسے صرف ان کی مدد کے لیے بلند ہونے والی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

آخر کار وہ چٹانوں کے قریب پہنچے۔ ولیم ڈارلنگ کشتی میں سے کود کر باہر چٹانوں پر چڑھ گئے۔ اب گریس کو تنہا کشتی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ اسے کشتی کو ایک جگہ پر رکھنے کے لیے پتواروں کو مسلسل چلانا پڑ رہا تھا۔ وہ کشتی کو چٹان سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ چٹان پر نو افراد تھے جن میں سے ایک شخص بری طرح زخمی تھا۔ کشتی میں گریس اور اس کے والد کے علاوہ صرف پانچ لوگوں کی گنجائش تھی۔ زخمی شخص اور اس کے علاوہ چار افراد کو گریس اور اس کے والد مینارۂ نور تک لائے۔ اس کے بعد فورفشائر جہاز کے بچتے ہوئے دو مسافر جو کہ ملاح تھے۔ وہ دونوں اور ولیم ڈارلنگ دوبارہ چٹانوں تک آئے اور ان بقیہ چار افراد کو مینارۂ نور لے گئے جو کہ چٹان پر ہی رکے ہوئے تھے۔

گریس کے پاس ابھی آرام کرنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ تمام دن وہ اپنی والدہ کے ساتھ بچائے گئے مسافروں کی

دیکھ بھال کرنے، ان کو سردی سے بچانے اور کھانا کھلانے میں مصروف رہی۔ کئی دن بعد یہ مسافر اپنے گھر جانے کے قابل ہوئے۔ وہ لوگ گریس اور اس کے والدین کی بہادری اور خدمت گزاری سے بے حد متاثر ہوئے۔ اپنے اپنے گھر جانے کے بعد انھوں نے ان کی کہانی اپنے گھر والوں اور دوستوں کو سنائی۔ اچانک گریس اور اس کے والدین مشہور ہوگئے۔ ان کی کہانی تمام اخبارات کے صفحۂ اوّل کی زینت بنی۔ گریس اور اس کے والد کو ان کی بہادری کا خاص انعام دیا گیا۔ انھیں رائل ہیومن سوسائٹی کی طرف سے طلائی تمغے اور انگلینڈ کے شاہی قومی ادارہ برائے جہاز رانی کی جانب سے چاندی کے تمغے دیے گئے۔ رائل نیشنل لائف بوٹ انسٹی ٹیوشن RNLI کی جانب سے اسے 'سمندر کی شہزادی' کا خطاب بھی دیا گیا اور RNLI سے میڈل حاصل کرنے والی پہلی خاتون بن گئی۔ ملکۂ وکٹوریہ نے اسے خصوصی طور پر پچاس پاؤنڈ کا انعام بھیجا اور اسے شاہی مہمان بھی بنایا۔

اس واقعہ کے بعد تمام لائف ہاؤس کیپرز کی تنخواہوں میں اضافہ کردیا گیا اور انھیں خصوصی مراعات دی جانے لگیں تاکہ وہ لوگ دور دراز ساحلوں پر اپنی تنہائی کی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکیں اور حادثے کا شکار ہونے والے مسافروں کی مدد کرسکیں۔

اس واقعے کے چار سال بعد 1842 میں گریس کو تپ دق (T.B) کا مرض ہوگیا۔ 20 اکتوبر 1842 کو 27 سال کی عمر میں گریس کا انتقال ہوگیا۔ اسے سینٹ ایڈن چرچ، بامبرگ St Aidan's Churchyard، Bamburgh میں دفن کیا گیا۔ گریس ڈارلنگ اپنی بہادری کی وجہ سے عوام میں مشہور تو تھی ہی مگر اس کی المناک موت نے اس کی شخصیت کو اور بھی زیادہ طاقتور اور پائیدار بنا دیا۔ اس کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے RNLI نے بامبرگ میں اس کے نام سے ایک میوزیم قائم کیا۔ 'گریس ڈارلنگ میوزیم' اس کی شخصیت ادب، ثقافت اور آرٹ کا حصہ بن گئی۔ اس کی بہادری پر انگریزی ادب میں بے شمار نظمیں، کہانیاں، گیت اور کتابیں لکھی گئیں۔ ان گنت پینٹنگز بنائی گئیں۔ RNLI کے قائم کردہ میوزیم میں گریس کی بہت ساری یادیں ہیں۔ وہاں وہ کشتی اور چپواریں بھی رکھی ہیں جن کے ذریعے گریس نے ان مسافروں کو بچایا تھا۔ اس کی کتابیں، کپڑے، جوتے، پینٹنگز وغیرہ غرض اس سے جڑی ہر چیز اسے میوزیم میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سینٹ ایڈن چرچ میں اس کا پتھر کا مجسمہ بھی بنایا گیا ہے۔ آج 180 سال سے زیادہ عرصہ ہوچکا ہے مگر آج بھی لوگ اس کی کہانی سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ کس طرح ایک لڑکی نے اپنی بے لوث ہمت اور مخلصانہ جذبات کے تحت دوسروں کو بچانے کے لیے خود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

حوالہ جات

(1) 'مائی انگلش بک' ہشتم جماعت کے لیے، مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک نرمتی وابھیاس کرم سنشودھن منڈل، پونہ، طباعت دوم 2020

2. www.britannica.com-Grace Darling-British Heroine
3. en.in.wikipedia.org-Grace Darling-English light house keeper

■

Ansari Asma Bano Saleem Akhtar
House No 16, Survey No: 374
Madina Park, Near Masjide Masood
Firdos Nagar
Dhule - 424001 (Maharashtra)

یاد آرہا ہے مجھ کو بچپن کا وہ زمانہ!

قاضی مشتاق احمد

قاضی مشتاق احمد اردو کے معروف ادیب ہیں۔ وہ مہاراشٹر سول سروسز میں ایڈیشنل کلکٹر اور ایڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ سماجی بہبود کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کی 70 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جہاں انھوں نے بڑوں کے لیے 'اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک'، 'خاندیش: تاریخی، تہذیبی ادبی مطالعہ' جیسی کتابیں لکھی ہیں، وہیں انھوں نے بچوں کے لیے زندہ مورتی، چندا ماما کے گاؤں میں، نیا کلینڈر، سچی کہانیاں اور بچوں کی رامائن جیسی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کے ناول، افسانے اور رپورتاژ ادبی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔

'بچوں کی دنیا' (نومبر 2020) میں جناب حقانی القاسمی کا 'ماہنامہ کھلونا ایک انتخاب' پر تبصرہ پڑھ کر مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری پیدائش مشرقی خاندیش (ضلع جلگاؤں مہاراشٹر) کے ایک علمی، ادبی خاندان میں ہوئی۔ میرے والد محترم الحاج میر چاہت علی سیشن کورٹ میں ناظر کے عہدے پر فائز تھے، اس کے علاوہ صاحبِ طرز ادیب اور مزاح نگار تھے۔ ان کی تخلیقات اس زمانے کے موقر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ والد مرحوم بہت خوش بیان اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ انھیں سیکڑوں لطیفے اور قصے یاد تھے۔ جس محفل میں جاتے اسے گل و گلزار بنا دیتے۔ میں بچپن میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ان کے دوستوں کی محفل میں بھی شریک ہوجاتا تھا۔ انھیں کتابیں اور رسائل پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میرے لیے وہ خوبصورت کہانیوں کی کتابیں لاتے تھے۔ جب میں پڑھنے لکھنے لگا تو

میرے لیے 'کھلونا' ضرور لاتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے شہر جلگاؤں میں اردو رسائل صرف ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال پر ہی دستیاب ہوتے تھے۔ ہمارے گھر سے ریلوے اسٹیشن قریب دو تین کلومیٹر دور تھا۔ مجھے بچپن سے پیدل چلنے کا شوق تھا اس لیے دو تین کلومیٹر پیدل چلنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں تھی البتہ میری اماں بڑی فکرمند ہوجاتیں اور بار بار ہدایت کرتیں کہ ریلوے لائن کبھی کراس مت کرنا خطرہ ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ میں بڑا ہوجانے کے بعد بھی ریلوے لائن کبھی کراس نہ کرنے کے اصول پر پابند رہا۔ ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال کا مالک میری اس بات سے بہت متاثر تھا کہ میں ایک بار نہیں بلکہ دو تین بار 'کھلونا' خریدنے کے لیے ریلوے اسٹیشن کے چکر کاٹتا ہوں۔ میرے ساتھ وہ بڑی شفقت کا برتاؤ کرتا۔ مجھے بیٹھنے کے لیے اسٹول دیتا اور بک اسٹال میں موجود اردو رسائل کی ورق گردانی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اگر اسٹیشن سے واپس لوٹنے میں دیر ہوجاتی تو والدہ بہت متفکر ہوجاتیں۔ میری والدہ فردوس مکانی نجن زبیدہ خاتون بے حد ذہین تھیں۔ انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق مدرسہ اور گھر میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے نانا مرحوم حکیم حاذق تھے۔ انھیں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ صدر مدرسی سے وہ سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن نصیرآباد سے جلگاؤں آگئے تھے۔ اپنے مکان کے آنگن میں وہ اپنے جان پہچان والوں اور دوستوں کی محفل جماتے۔ ان کی دلچسپ باتیں سننے کے لیے میں اکثر ان کی محفلوں میں بھی شریک ہوجاتا تھا۔ ہمارا آبائی وطن جلگاؤں سے قریب ارنڈول نامی شہر ہے۔ ہم لوگ عموماً چھٹیوں میں ارنڈول جاتے تھے۔ میرے دادا مرحوم شہر ارنڈول کی میونسپل کاؤنسل کے 35 برسوں تک رکن، وائس پریسیڈنٹ تھے۔ وہ عالم دین تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں سیکڑوں کتابیں موجود تھیں۔ ان کے پاس اودھ کے رسائل بھی آتے تھے۔ میری دادی جان بی بیگم صاحبہ صوم وصلوٰۃ کی پابند عبادت گزار خاتون تھیں۔ وہ بڑی نیک اور خدا ترس تھیں۔ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں۔ میں جب بھی ارنڈول جاتا میری بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ میں بہت دبلا پتلا تھا۔ دادی اماں میرے لیے ایک کٹورے میں ملائی نکال کر مجھے دے دیتیں۔ انھیں بھی بہت سی کہانیاں اور نظمیں یاد تھیں۔ ان کے یہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہر آنے جانے والے کی وہ خاطر مدارات کرتیں۔ گھر کے پشت میں گائے بھینسیں تھیں۔ دودھ، دہی، چھاچھ، کی ندیاں بہتی تھیں۔ محلے کے لوگوں میں چھاچھ مفت تقسیم ہوتیں۔ رمضان کے مہینے میں سحری اور افطار کے لیے بھراپُرا دسترخوان ہوتا۔ سحری کے وقت دادا جان بذات خود اپنے قریبی رشتے داروں اور غربا کے گھر گھر جاکر کھانے پینے کا سامان مہیا کرتے۔ سید محلہ کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی وہ خود ادا کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد جب وہ مسجد کے باہر نکلتے تو کئی لوگ عموماً غیر مسلم خواتین پانی کے گلاس لے کر کھڑی ہوتیں تاکہ وہ اس پر درود کا ورد کردیں۔ نماز کے بعد وہ خواجہ حرم قتال کے آستانے پر تلاوت قرآن کے لیے تشریف لے جاتے۔ وہاں سے بازار جاتے اور ٹوکرے بھر کر سبزیاں، پھل فروٹ لے کر آتے۔ جب راستے سے گزرتے تو لوگ عزت و احترام کے ساتھ کھڑے ہوکر انھیں سلام کرتے۔ ہر کسی سے وہ بڑی خوش دلی کے ساتھ بات چیت کرتے۔ خیر خیریت دریافت کرتے۔ ان کے دیوان خانہ (مقامی زبان میں 'بیٹھک') میں ان سے ملنے جلنے والوں کا ہجوم جمع ہوجاتا۔ سید محلہ میں خواتین پردہ کی پابند تھیں۔ اس لیے کسی غیر کا داخلہ ممنوع تھا۔ اگر کسی وجہ سے کوئی آجاتا تو ایک شخص خواتین کو

خبردار کرنے کے لیے اطلاع دیتے ہوئے آگے آگے چلتا۔ ماضی اور خصوصاً بچپن کی خوشگوار ساعتیں آج بھی ذہن میں تازہ ہیں۔

ارنڈول کے سید محلّہ کے خوشگوار اور پر رونق ماحول میں چھٹیاں گزارنا ہر 'دن عید اور رات شب برات' جیسا تھا۔ دادا میاں کے دیوان خانے میں ان سے ملاقات کے لیے عام لوگوں کے علاوہ سرکاری افسران، سماجی کارکنان، بھی آتے تھے۔ دیوان خانہ رہائشی مکان سے تھوڑے فاصلہ پر لبِ سڑک تھا اس لیے وہاں آنے جانے میں لوگوں کو آسانی تھی۔ دادا جان کے دوستوں میں ایک صاحب معاملدار (تحصیل دار) بھی تھے۔ وہ اپنے ٹانگہ پر سوار ہوکر بڑی شان سے آتے۔ آگے پیچھے دو چار ہرکارے ہوتے۔ وہ ٹانگہ سے اتر کر نیچے اترتے تو وہاں موجود لوگ ان کا پرجوش خیر مقدم کرتے۔ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے۔ ان کی خوب خاطر مدارت ہوتی۔ دادی اماں اپنے رہائشی مکان کی کھڑکی سے تحصیلدار صاحب کے رعب و دبدبہ کا نظارہ کرتی تھیں۔ مہاراشٹر میں احتراماً معاملدار (تحصیلدار) کو 'راؤ صاحب' کہا جاتا ہے۔ دادی اماں مجھے دُلار سے 'راؤ صاحب' کہہ کر پکارتی تھیں۔ شاید یہ ان کی زبانی میرے مستقبل کی پیشن گوئی تھی کہ میں بڑا ہوکر مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہوکر معاملدار (تحصیلدار) ہی بنا۔ یہ 'تحصیلدار' کا عہدہ میرے سر پر ایسا سوار ہوا کہ جب میں نے مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن کے مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لینے کے لیے درخواست دی تو ترجیحات کے کالم میں پہلا نمبر 'تحصیلدار' کو دیا۔ حالانکہ یہ امتحان ڈپٹی

کلکٹر، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے لیے بھی تھا۔ میں گریجویشن کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ممبئی آیا تھا۔ میرے والد مرحوم مجھے جج بنانا چاہتے تھے۔ جب میں نے ایس ایس سی کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ والد صاحب یہ خوشخبری لے کر اپنے پاس سیشن جج کے بنگلہ پر مٹھائی لے کر گئے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ سیشن جج نے میری امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے پر مبارکباد دی تھیں۔ انھوں نے والد صاحب سے کہا تھا ''اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے بیٹے کو کلرک کی حیثیت سے ملازمت دے سکتا ہوں۔'' والد صاحب کو شاید یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے جواب دیا ''میں اسے آپ کی طرح سیشن جج بنانا چاہتا ہوں۔''

ان کا خواب پورا کرنے کے لیے میں نے لا کالج میں داخلہ تو لے لیا تھا لیکن اخباری دنیا سے منسلک ہوجانے کی وجہ سے میری توجہ اخبار نویسی، کالم نگاری، افسانہ اور ناول نگاری پر زیادہ تھی۔ فلمی پریمیئرز، پارٹیاں، ثقافتی پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے پڑھائی کیا خاک ہوتی۔ فلمسازوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانے کا شوق مہنگا پڑا۔ اخبارات میں یہ تصویریں دیکھ کر والد صاحب سخت برہم ہوئے اور انھوں نے مجھے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے لیے کہا۔ حالانکہ میں فلمی دنیا میں بحیثیت رائٹر شامل ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ مقابلہ جاتی امتحان کے تحریری امتحان میں بھی کامیابی ملی اور انٹرویو میں بھی میری اخبار نویسی، ڈراما بازی کام آئی۔ مجھ سے زیادہ تر سوالات اردو زبان وادب کے بارے میں پوچھے گئے۔ کمیشن کے صدر لیفٹیننٹ جنرل تھورات تھے۔ ممبران میں بمبئی ڈویژن کے کمشنر مسٹر پٹوردھن تھے۔ انھوں نے میرا بایوڈاٹا دیکھ کر مجھ سے پہلا سوال کیا ''کیا آپ نے بہادر شاہ ظفر کی غزل 'لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں' پڑھی ہے؟ میں نے جواب دیا ''سر! صرف پڑھی نہیں بلکہ مجھے پوری غزل یاد ہے جو میں نے اپنے کالج گیدرنگ میں ترنم کے ساتھ پڑھی تھی۔'' انھوں نے کہا ''تو اسی انداز میں سنائیے'' اور میں نے ترنم کے ساتھ وہ غزل سنائی جسے سب نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی۔'' دوسرا سوال ''کیا آپ نے حیدرآباد کے محرم دیکھے ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''بدقسمتی سے دیکھے نہیں ہیں'' تیسرا سوال ''شیعہ اور سنی میں کیا فرق ہے؟'' اس کا جواب میں نے تفصیل سے دیا۔ آخر میں لیفٹیننٹ جنرل تھورات نے پوچھا ''تم کس عہدے پر کام کرنا چاہتے ہو؟'' یہاں میرے اردو ذریعہ تعلیم کی کمزوری ابھر کر سامنے آگئی اور میں نے جواب دیا ''سر! آپ جس عہدہ کے قابل مجھے سمجھتے ہیں۔'' یہ جواب احساسِ کمتری کا مظہر تھا اس لیے میرا انتخاب 'تحصیلدار' کے عہدے کے لیے ہوا۔ جو امیدوار ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے تھے وہ ڈویژنل کمشنر اور سکریٹری بن کر ریٹائر ہوئے اور مجھے ایڈیشنل کلکٹر کے عہدہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب بھی میں کسی کریئر گائیڈنس سمینار میں جاتا ہوں تو مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے خواہش مندوں کو یہ مشورہ ضرور دیتا ہوں کہ محض اردو ذریعۂ تعلیم میں تعلیم حاصل کرنے کو اپنی خامی نہیں بلکہ اپنی طاقت سمجھے۔ ان شاءاللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

■

Qazi Musthaque Ahmad
B/6, RAY- Venue Society
I.C.S. Colony
Pune - 411007 (Maharashtra)
Mob.: 9422317129

نظم

قدرت اور نعمتیں

خیال انصاری

خیال انصاری بچوں کے ہفت روزہ اخبار 'خیراندیش' مالیگاؤں کے مدیر ہیں۔ ان کے بقول برصغیر ہندو و پاک کا یہ پہلا بچوں کا اخبار ہے جو گذشتہ 32 برسوں سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔ خیال انصاری بڑوں اور بچوں دونوں کے لیے افسانے شاعری اور مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'اجالوں کا کرب' کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ بچوں کے لیے ہند و پاک کے مشہور رسائل میں ان کی کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

جل تھل ہوا ہے آنگن
برسا ہے خوب پانی
کاغذ کی ایک کشتی
ہم کو بنا دو باجی

کشتی پہ بیٹھ کر ہم
نکلیں گے سیر کرنے
دیکھیں گے باغ سارا
وہ دلفریب جھرنے

تازہ ہوا کا جھونکا
کلیوں کا مسکرانا
وہ بھینی بھینی خوشبو
پھولوں کا دل لبھانا

سبزے پہ بکھری شبنم
شاخوں کا جھول جانا
اڑتی پری سی تتلی
بھونروں کا گنگنانا

آنکھوں کو دیں جو ٹھنڈک
گلشن کے یہ نظارے
قدرت کی نعمتیں ہیں
راحت کے یہ سہارے

شاخیں لدیں ہوں پھل سے
چڑیوں کا چہچہانا
یہ زندگی کا منظر
ہم کو سدا دکھانا

لازم ہے ہم پہ بے شک
شکرِ خدا ادا ہو
فضل و کرم ہو ہم پر
لب پہ سدا دعا ہو

■

Khayal Ansari
Editor 'Khair Andesh Weekly, Malegaon
772, Khusamadpura, Malegaon
(Nashik) - 423203
Mob.: 9270910011

محمد وکیل

نیٹ کا ہے زمانہ یہ بچو

نیٹ کا ہے یقیناً زمانہ
اب چلے گا نہ کوئی بہانہ
محتشم نے یہ ابوّ سے بولا
ڈرتے ڈرتے ہی منہ اس نے کھولا
ٹیلی ویژن سے دل بھر گیا ہے
نیٹ اب دل میں گھر کر گیا ہے
رب نے کیا کیا موجد دیے ہیں
خوب ایجاد سب نے کیے ہیں
یہ بھی ارمان پورا کرا دیں
نیٹ کا اب کنیکشن دلا دیں
جب ہے سائنس کا راج قائم
راہ رَو اس کا بن جاؤں دائم
نیٹ کا لب پہ ہے اب ترانہ
علم کا اس میں ہے سب خزانہ
نسلِ نو کو ہے اس کی ضرورت
اب تو سائنس کی ہے حکومت
مجھ کو بھی تُو موجد بنادے
مولا مجھ کو ہُنر یہ سکھا دے
کر رہے ہم ہیں دُنیا کی سیر اب
شکر کیسے ادا ہم کریں رب
ساری ایجاد رب کی عنایت
جس کی دنیا کرے ہے عبادت

■

Md Wakeel C/o Ahmed Wakeel Aleemi
B.L: 4, Holding No:5, Kankinara
24- Parganas (N) - 743126 (West Bengal)

محمد عادل فراز

کیا خوب ہیں نظارے چھبیس جنوری کے

کیا خوب ہیں نظارے چھبیس جنوری کے
بھارت میں چھا رہے ہیں موسم بڑی خوشی کے

بچوں سے کہہ رہی ہیں خوش ہو کے آج مائیں
ہاتھوں میں لے کے پرچم بھارت کا لہلہائیں
سب ایک ساتھ مل کر خوشیوں کے گیت گائیں
چھبیس جنوری ہے دنیا کو یہ بتائیں
نغمے بکھر رہے ہیں ہر سمت زندگی کے

اب دور ہو چکے ہیں مشکل کے وہ زمانے
بھارت کے اس چمن میں خوشیوں کے ہیں ترانے
ہر شخص گا رہا ہے خوش ہو کے آج گانے
مدہوش ہو رہے ہیں لگتے ہیں سب دِوانے
چہرے دمک رہے ہیں بھارت میں ہر کسی کے

لے کر ترنگا بچّے خوشیاں منا رہے ہیں
ہندوستاں کی جئے کے نعرے لگا رہے ہیں
پرچم یہ ایکتا کا مل کر اٹھا رہے ہیں
گھر گھر محبتوں کے دیپک جلا رہے ہیں
وہ گیت گا رہے ہیں بھارت کی شانتی کے

دھرتی کو آج دُلہن مل کر سبھی بنا دو
ہر سو محبتیں ہیں سب کو یہی دکھا دو
جو نفرتوں کی چھائے کالی گھٹا ہٹا دو
پھولوں سے دل کی نگری اپنے سبھی سجا دو
پیغام سب میں بانٹو گاندھی کی سادگی کے

خونِ جگر سے اپنے گلشن کو ہے سجایا
ظلم و ستم کے آگے ہرگز نہ سر جھکایا
محنت سے اپنی ہم نے تقدیر کو بنایا
قربانیاں جو دیں ہیں تو دن یہ آج پایا
عادل دکھاؤ جوہر تم بھی تو شاعری کے

■

Er. Mohd Adil
Hilal House, H No.: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah, Civil Line
Aligarh - 202002 (UP)

الیاس احمد انصاری شاداب

لاک ڈاؤن اور ہم

وبا تھی وہ ایسی کہ جانوں پہ آئی
کورونا نے ایسی تباہی مچائی
تھی اس لاک ڈاؤن کی باتیں نرالی
سفر بند تھے سب، دوکانیں بھی ساری
گھروں میں مقید تھے اپنے بیگانے
بنے پھر بھی اک دوسرے کے سہارے
سبھی فکر تھی امی، ابو کو لاحق
انھوں نے کھلائی ہمیں چیز ہر اک
شرارت سے بھرپور ہم شور کرتے
تو 'منصف' ہمیں خوب دھوکہ یہ دیتے
وہ کہتے کہ کوئی نہ ہو شور اندر
کھڑے ہیں بہت غصے میں پاپا باہر
پڑھائی بھی کی اور موبائل پہ کھیلے
مزے زندگی کے گھروں میں ہی لوٹے
اسی لاک ڈاؤن سے ہم نے یہ سیکھا
صفائی بھی رکھنا، سلیقہ سے جینا
مٹا اس وبا کو تو جڑ سے اے مولیٰ
جہاں پھر سے شاداب کردے اے مولیٰ

■

Ilyas Ahmad Ansari Shadab
Atar Gali, Mominpura
Akola - 444001 (Maharashtra)

خطاب عالم شاذ

چھوٹا سا ننھا سا پیارا سا بچہ

چھوٹا سا ننھا سا پیارا سا بچہ
وہ سب کے لیے ہے دلارا سا بچہ
ہنسے تو بہت وہ پیارا لگے ہے — روئے تو بھی وہ دلارا لگے ہے
ہنسنا و رونا بھی ہے اس کا پیارا — وہ ہر اک ادا میں ہے سب سے نرالا
زباں بھی اس کی ہے اتنی نرالی — سمجھ میں نہ آئے پھر بھی ہے پیاری
چھوٹا سا ننھا سا پیارا سا بچہ
وہ سب کے لیے ہے دلارا سا بچہ
وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے — ہر اک شے سے بھی خوب وہ کھیلتا ہے
تنہائی میں بھی وہ یوں مسکرائے — کہ جیسے فرشتہ اسے کوئی کھلائے
معصومیت اس کی سب کو ہی بھائے — اسے جو بھی دیکھے گودی اٹھائے
چھوٹا سا ننھا سا پیارا سا بچہ
وہ سب کے لیے ہے دلارا سا بچہ

■

Khatab Alam
H.No: 23, BL.: 5, P.O: Kankinara
Distt.: North 24 Parganas - 743126 (W.B)

رئیس ستارہ

بلی رانی

فاطمہ نے اک بلی پالی
تھوڑی بھوری تھوڑی کالی
عائشہ اس کو دودھ پلاتی
فاطمہ اس کو کھانا کھلاتی
سلّو [1] بھیا کھانا لاتا
یعنی ہر دن قیمہ لاتا
شوق سے بلی کھانا کھاکر
سوتی ہے پاؤں پھیلا کر
دونوں بچیاں شور مچاتیں
جب کبھی کتیاں بھونکنے لگتیں
مسئلہ یہ بھی حل ہوجاتا
سلّو بھیا ڈنڈا لاتا
جب بچوں کا کھیل ہے چلتا
بلی کا بھی حصہ ہوتا
بلی بھی فنکاری دکھاتی
سب بچوں کا دل بہلاتی
خوش ہیں بچے بلی پاکر
جیسے راجہ دلی پاکر
خوب ہے اپنی بلی رانی
نام رکھا ہے اس کا سونی

■

[1] سلّو بھیا یعنی سلطان بھیا

Raees Sitara
Kallan Sitara Chauk
Sitara, Tailor. S, Golden Nagar
Malegaon - 423203 (Maharashtra)

کائنات خلیق

بچے

زمیں کے شگوفے ہیں معصوم بچے
تر و تازہ غنچے ہیں معصوم بچے
سمجھتے بھی ہو یہ ہیں انمول موتی
ہیں امروز فردا کے مخدوم بچے
رکھو ہاتھ تم ان کے سر پر ہمیشہ
ہوئے باپ ماں سے جو محروم بچے
جو کھلنے سے پہلے ہی مُرجھا نہ جائے
وہ ہیں پھول جنت کے مرحوم بچے
رسول خدا کو ہے ان سے محبت
نہ وہ دیکھ سکتے تھے مغموم بچے
جو صحت سے تعلیم سے بہرہ ور ہوں
نئی دنیا کرتے ہیں معلوم بچے
موثر یہ ماحول سے ہو نہ جائیں
فضا دیکھتے جب ہیں مسموم بچے
گراں قدر سرمایۂ ملک و ملت
مچاتے ہیں دنیا میں یہ دھوم بچے
یہ بچپن کا عالم ہے شاہی زمانہ
نہیں ہیں کسی کے یہ محکوم بچے
جو محروم تعلیم اور تربیت ہیں
وہ سوسائٹی کے ہیں مظلوم بچے

■

Kainat Khaleeq
861, IInd Floor, Flat No 201, 202, 203
Inayat Apartment Opp. Salauddin School
Bhiwandi - 421302 (Maharashtra)

صبا منیر

قدرت کے یہ نظارے

لگتے ہیں کتنے پیارے
قدرت کے یہ نظارے
دل کو سبھی کے بھائیں
منظر یہ پیارے پیارے

ٹھنڈی ہواؤں کا یوں
چھو کر ہمیں گزرنا
موسم کی تازگی کا
دل کے سبھی کو بھانا
بادل کا پھر گرجنا
برسات کا برسنا
بوندوں کا شبنموں کی
پتوں سے پھر مچلنا

لگتے ہیں کتنے پیارے
قدرت کے یہ نظارے
دل کو سبھی کے بھائیں
برسات کے نظارے...
مٹی کی خوشبوؤں کا
چاروں طرف مہکنا
رنگین تتلیوں کا
ہر سمت پھر بکھرنا
چڑیوں کا چہچہانا
کھیتوں کا لہلہانا
باغوں میں بلبلوں کا
چلتا رہے یہ گانا

لگتے ہیں کتنے پیارے
قدرت کے یہ نظارے
دل کو سبھی کے بھائیں
بلبل کے پیارے گانے

لگتے ہیں کتنے پیارے
لگتے ہیں کتنے پیارے

■

Saba Muneer
Maulana Azad College
Rauza Bagh
Aurangabad - 431001 (Maharashtra)

طوطے کے بچے

ذکیہ مشہدی

ذکیہ مشہدی اردو کی ممتاز فکشن نگار اور مترجم ہیں۔ پچھلے 46-45 سال سے وہ فکشن لکھنے میں مصروف ہیں۔ انہیں ساہتیہ اکادمی جیسے موقر ادارے کا ترجمہ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ بچوں کے ادب سے ان کا بہت گہرا شغف رہا ہے۔ بچوں کے رسائل میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں اور بچوں کے لیے ان کی کئی کتابیں بھی منظرعام پر آچکی ہیں جن میں مکھانے کی کھیر، دانیال، دادا اور جائسی، آمنہ اور اس کا مٹھو، ایک چونّی ندی میں، پتھر کی ترکاری قابل ذکر ہیں۔

اسکول میں چھٹیاں ہوتیں تو فرحان کبھی کبھی نانا کے یہاں آجاتے تھے۔ نانا گاؤں میں رہتے تھے۔ فرحان کو وہاں بہت مزہ آتا تھا۔ بڑا سا کھلا کھلا سرخ ٹائلوں والا گھر تھا۔ گھر کے پیچھے کافی وسیع باغ۔ سامنے بھی پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ پھول آنکھوں کو کیسے بھلے لگتے ہیں۔ تھوڑے سے بھی ہوں تو ماحول بدل جاتا ہے۔ جی اپنے آپ ہی خوش ہو جاتا ہے۔ پھر وہاں رجّن بھی تھا۔ وہ فرحان کو گاؤں بھر میں گھماتا پھرتا۔ تالاب میں سنگھاڑے کی بیلیں۔ کھیت میں گنّے اور چنا مٹر۔ آگ میں بھنی ہوئی شکر قند۔ گنّے کے رس کو کڑھاؤ میں اُبال کر بنتا ہوا گُڑ۔ کئی بار دیکھنے کے بعد بھی یہ ساری چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ہوا میں انوکھی فرحت محسوس ہوتی تھی۔

رجّن نانا کے منشی جی کا بیٹا تھا۔ منشی جی گھر کے سارے کاموں کا انتظام دیکھتے۔ باغ کے آموں کی فصل پکواتے۔ کچھ زمینیں تھیں، ان کا حساب رکھتے۔ باغ کے اگلے سرے پر نانا نے ان کے لیے دو کمروں کا چھوٹا سا گھر بنوا دیا تھا۔ اس میں برآمدہ، باورچی خانہ اور بیت الخلا سب ہی کچھ تھا۔ رجّن کو

نانا اسکول میں پڑھوا رہے تھے۔

اس مرتبہ فرحان نانا کے گھر آئے تو انھوں نے باغ میں گھومتے ہوئے ایک نئی چیز دیکھی۔ آم کے درخت کے تنے میں ایک کوٹر بن گیا تھا۔ اس میں سے ایک بڑا خوب صورت طوطا گردن نکال کر جھانک رہا تھا۔ فرحان کو وہ بہت پیارا لگا۔ جیسے کوئی کھڑکی میں سے جھانک رہا ہو۔ وہ منھ اُٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ طوطے نے جھٹ سے گردن اندر کر لی۔

''یہاں طوطا تھا۔'' فرحان نے رجّن سے کہا۔

''ہاں، ہوگا ہی۔ وہ اس کا گھر ہے۔''

''طوطے کا گھر۔''

''ہاں۔ مطلب اس کا گھونسلا۔ اس نے بچے نکالے ہیں، اور بے وقوف وہ طوطی ہے۔ ان بچوں کی ممی۔''

''ہا ہا ہا۔ طوطوں کی ممی۔ فرحان کو بہت مزہ آیا۔ سب جانوروں کی، پرندوں کی ممی تو ہوتی ہی ہیں۔ ممی نہیں ہوں گی تو بچے پالے گا کون۔'' لیکن گھونسلا تو پیڑ پر ہونا چاہیے۔ بیل کے درخت پر کوے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ انھوں نے کہا۔ رجّن فرحان کو گاؤں میں گھماتا تو خوب تھا لیکن کبھی کبھی شہری بابو کہہ کر چڑاتا بھی تھا۔ اس وقت بھی اس نے چڑایا۔

''ارے شہری بابو، طوطے زیادہ تر کسی کھوکھلی جگہ جیسے پیڑ یا پہاڑی کے کوٹر میں گھونسلا بناتے ہیں۔ اس میں انڈے دے کر انھیں سیتے اور بچے نکالتے ہیں۔ ہم اس طوطے کو شروع سے دیکھ رہے ہیں۔ کوٹر میں بچے نکل چکے ہیں۔ اب تو کچھ بڑے ہوئے ہوں گے۔''

فرحان نے تالی بجائی۔ ''ہم انھیں دیکھیں گے۔ طوطے کے بچے۔ آہا کتنے پیارے لگیں گے۔''

''ابھی باہر نہیں آتے۔ کیسے دیکھو گے۔'' رجّن نے کہا۔

''کوٹر زیادہ اونچائی پر نہیں ہے۔ اس کے پاس موٹی سی شاخ بھی ہے۔ ہم اس پر چڑھ کر بچے دیکھیں گے۔'' گاؤں میں برابر آتے رہنے کی وجہ سے فرحان کو پیڑ پر چڑھنا آتا تھا۔ دراصل رجّن نے ہی سکھایا تھا۔ وہ تو بندر کی سی پھرتی سے کسی بھی پیڑ پر چڑھ جاتا تھا۔

''بچوں کی ممی ناراض ہوگئی تو تمھیں کاٹ لے گی۔'' رجّن نے ڈرایا۔

اس وقت بات آئی گئی ہوگئی لیکن فرحان کے دل میں طوطے کے بچے دیکھنے کا خیال بنا رہا۔ تیسرے دن فرحان کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اب پھر نہ جانے کب چھٹیاں ہوں گی۔ اس لیے دوپہر میں وہ چپکے سے باغ میں نکل گئے۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ طوطا — نہیں طوطی — پھر آدھا جسم نکال کر جھانک رہی تھی۔ پھر وہ اُڑ گئی۔ فرحان بہت خوش ہوئے۔ اچھا ہے بچے اکیلے مل جائیں گے ورنہ ان کی ممی کاٹ لیتی۔ وہ احتیاط سے پیر جما جما کر درخت پر چڑھ گئے۔ کوٹر میں جھانکا۔ کچھ ہرے ہرے پروں سے ڈھکے ننھے ننھے بچے دکھائی دیے۔ شروع میں زیادہ تر پرندوں کے بچوں پر پَر نہیں ہوتے۔ گوشت کے لوتھڑے سے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ بڑے ہوتے ہیں تبھی پر نکلتے ہیں۔ یہ بچے اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ ان پر پنکھ آ گئے تھے۔ بہت ہی پیارے لگے۔ فرحان کا جی چاہا انھیں ہاتھ میں لے کر دیکھیں۔ تبھی غصے سے ٹیں ٹیں کرتا طوطا ان کے سر پر منڈلانے لگا۔ فرحان نے جلدی سے ہاتھ ہٹایا۔ چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ یہ ضرور وہی ہے۔ بچوں کی ممی۔ انھوں نے گھبراہٹ میں سوچا اور جلدی سے پھسل کر اُتر آئے۔ دیکھا طوطا ان کے سر پر اب بھی منڈلا رہا ہے۔ وہ بگٹٹ بھاگے۔ اپنے گھر کی بجائے رجّن کے گھر کا رُخ کیا۔ اپنے گھر میں داخل ہوتے تو گھبراہٹ کی وجہ بتانی پڑتی۔ جلدی میں اُترتے ہوئے کچھ خراشیں آ گئی تھیں۔ ان کی وجہ بھی بتانی

پڑتی۔ اچھی طرح ڈانٹ پڑتی۔ پیڑ پر چڑھنے کے لیے مما ہمیشہ منع کرتی تھیں۔ نانا بھی منع کرتے تھے۔

رجّن گھر پر ہی تھا۔ وہ بہت ہنسا۔ اسے شرارت سوجھی۔

''پتہ ہے تمھیں طوطوں کی ممی نے پہچان لیا ہے۔ اب وہ تمہارا پیچھا کرے گی۔''

''فرحان ڈر گئے۔ تب کیا کریں۔''

''ایسا کرو تم اپنے کپڑے بدل لو۔ تب طوطا تمھیں نہیں پہچان سکے گا۔''

''لاؤ اپنے کپڑے۔'' فرحان راضی ہو گئے۔

''ہمارے پاس صرف تین شرٹ ہیں۔ ایک کو ممی نے صابن ڈال کر بھگو رکھا ہے۔ ایک ہم نے پہنی ہے۔ تیسری تمھیں پہنا دی تو ابھی نہا کر کیا بدلیں گے۔''

''تب؟'' فرحان سخت پریشان ہو گئے۔

''ایک طریقہ ہے۔ تم بابو جی کی شرٹ پہن کر چلے جاؤ۔ اپنے کپڑوں کے اوپر ہی ڈال لینا۔''

جان تو بچے گی۔ اب گھر پر جو بھی ہو۔ وہاں ڈانٹ پڑے گی۔ کوئی طوطا تو نہیں کاٹے گا۔ سوچ کر فرحان راضی ہو گئے۔ رجّن نے منشی جی کی قمیص نکال کر فرحان کو پہنا دی۔ منشی جی لمبے چوڑے آدمی تھے۔ نو سال کے فرحان تو ان کی شرٹ میں جیسے ڈوب ہی گئے۔ بالکل پیروں تک آ گئی۔ مسخروں جیسے حلیے میں انھوں نے پورا باغ پار کیا اور گھر میں داخل ہوئے۔ رجّن کچھ دور تک ساتھ آیا، پھر چپکے سے پلٹ گیا۔

ممی سامنے ہی کھڑی ٹوکری میں پھل رکھ رہی تھیں جو نانی نے دیے تھے۔ شام کو واپس جانا تھا۔ یک دم سے فرحان پر نظر پڑی تو گھبرا گئیں۔ ''ارے مما ہم ہیں۔ ہم فرحان۔'' ممی کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ جلدی سے بولے۔

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ اور یہ قمیص تو منشی جی کی ہے۔'' ممی نے ٹوکری الگ رکھ کر پوچھا۔

مجبوراً فرحان نے پوری کہانی سنائی۔ وہ ابھی تک وہی قمیص پہنے کھڑے تھے۔ تبھی نانا بھی آ گئے۔ باورچی خانے سے روٹی پکاتی قمرن بوا نے جھانکا اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ توے پر روٹی جل اُٹھی۔ نانی نے مینا پال رکھی تھی، اس نے شور مچایا ''کون ہے، کون ہے!''

پیچھے کچھ رک کر رجّن بھی آ گیا تھا۔ وہ خوب قہقہے لگا رہا تھا۔ ''ارے بابو جی کی شرٹ تو اُتارو۔'' اس نے قمیص اُتروائی۔

''مما، ہم اگلی بار نانا کے یہاں آئیں گے تب بھی طوطوں کی ممی ہمیں پہچان کر سر پر ٹھونگ لگائے گی؟'' فرحان نے پوچھا۔

لوگ پھر ہنس پڑے۔ ''نہیں تب نہیں پہچانے گی۔ بھول چکی ہوگی۔'' نانا نے کہا۔

مگر رجّن ٹپ سے بول پڑا۔ ''ممی نہیں پہچانے گی لیکن تب بچے تمھیں پہچان لیں گے۔ تینوں مل کر تمھیں ٹھونگ لگائیں گے۔''

فرحان روہانسے ہو گئے۔

نانا نے ہنس کر کہا، ''بے وقوف، رجّن تمھیں چھیڑ رہا ہے لیکن ہاں، پرندوں کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ کسی بھی جانور کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں بھی چین سے رہنے کا حق ہے۔ وہ ہمارے ماحول کا بہت ضروری حصہ ہیں۔''

■

Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court
Judges Court Road
Patna - 800004 (Bihar)

انصاف کا ناٹک

محمد طارق نگر پریشد اردو اسکول، چاندور بازار، ضلع امراوتی مہاراشٹر میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ کانٹے دار فصل، عینی شاہد، توبہ، شہر کی چوری، صدمہ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کتابوں میں لاقیمت خزانہ، شکاری پرندے، الٹا تیر اور پھلوں کا جلسہ قابل ذکر ہیں۔

آم کے گھنے پیڑ کی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں... کوئلیں کوک رہی تھیں طوطے 'ٹیں ٹیں' کر رہے تھے اور کوؤں نے 'کائیں کائیں' کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

پیڑ کی چھاؤں میں دو بلیاں، دم پھلائے، جبڑے کھینچے، دانت نکالے اپنے پنجے ایک دوسرے پر مارتے ہوئے آپس میں لڑ رہی تھیں ''غوں... غوں... غوں...''

بندر آم کے پیڑ کی ایک مضبوط شاخ پر بیٹھا، لڑتی ہوئی بلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بلی کوئلے جیسے کالے رنگ کی تھی۔ دوسری بلی دودھ جیسے سفید رنگ کی۔

دونوں بلیاں ایک دوسرے پر غراتے ہوئے حملے کر رہی تھیں... ''کیوں لڑ رہی ہیں بلیاں! کہیں بلیوں کا جھگڑا وہی پرانا جھگڑا تو نہیں، جس کا انصاف میرے ایک 'عقلمند' بزرگ نے کیا تھا۔'' بندر نے سوچا اور پیشانی پر اپنے ہاتھ کا شیڈ بنا کر۔ گردن لمبی کر کے لڑتی ہوئیں بلیوں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ 'ہاں' لگتا ہے وہی پرانا جھگڑا ہے۔'' بندر نے خود کلامی کی کیونکہ بندر کو چاند کی طرح گول روٹی نظر آ گئی تھی۔ جو لڑتی ہوئی بلیوں کے پاس پڑی تھی۔

روٹی دیکھ کر بندر کی باچھیں کھل گئیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا جیسے پہلے کبھی ہوا تھا۔ روٹی ایک اور روٹی کے لیے لڑنے والی بلیاں دو، یہ بہت ناانصافی ہے، مجھے انصاف کے

لیے درخت سے اترنا ہی چاہیے اور ویسا ہی انصاف کردینا چاہیے جو برسوں پہلے میرے عقلمند بزرگ نے کیا تھا۔ بندر نے اپنے بزرگ کے انصاف کے بارے میں سوچا۔

میرے بزرگ کے انصاف سے حضرتِ انسان کو انصاف کرنے کا ایسا 'گُر' ہاتھ آگیا تھا جس پر آج بہت سارے انسان عمل کرکے اپنا پیٹ ہی نہیں بھر رہے ہیں بلکہ عیش وعشرت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ بلیاں یہ بات نہیں جانتیں اسی لیے آج بھی وہ ایک روٹی کے لیے آپس میں لڑ رہی ہیں۔ روٹی کے لیے بلیوں کا لڑنا اور لڑتے رہنا میرے انصاف کو ہمیشہ قائم رکھے گا۔ بندر نے سوچا اور خوشی خوشی چھلانگیں مارتا ہوا درخت سے اتر کر بلیوں کے پاس پہنچ گیا۔

بندر کو اپنے قریب دیکھ کر بھی بلیوں نے لڑنا بند نہیں کیا۔ ایک دوسرے پر ان کے حملے تیز ہو گئے تھے۔

''پیاری بلیو! روٹی کے لیے ہی لڑ رہی ہو نا؟'' بندر نے لڑتی ہوئی بلیوں سے دریافت کیا۔

''ہاں...!'' بلیوں نے لڑائی جاری رکھتے ہوئے مختصراً 'ہاں' کہا اور پھر ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے لگیں...

''پیاری بلیو! رک جاؤ... برائے مہربانی اپنی لڑائی ختم کردو، میں تمھارا انصاف کرنے آگیا ہوں۔''

''تم...! تم ہمارا انصاف کرو گے!'' بلیاں اپنی لڑائی روک کر بندر کو سرتاپا گھورنے لگیں۔

''ہاں! میں ہی تمھارا انصاف کروں گا، تاریخ شاہد ہے جب جب بھی بلیاں روٹی کے لیے لڑی ہیں خدا نے بندر کو ہی انصاف کرنے کے لیے بھیجا ہے، شاید تم اپنی تاریخ بھول گئیں۔''

''ہاں، بندر بھائی؛ تاریخ تو انھیں یاد رہتی ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں... ہم تو بھوکی بلیاں ہیں!'' سفید بلی غمگین لہجے میں بولی۔

''ہم نہیں...، میں بھوکی ہوں!'' کالی بلی غرائی۔ ''روٹی میں کھاؤں گی کیونکہ روٹی کو پہلے میں نے دیکھا ہے۔''

''نہیں...، روٹی پر پہلے میری نظر پڑی۔ اس لیے اس پر میرا حق ہے،'' سفید بلی نے اپنا حق جتایا۔

''نہیں، روٹی پر میرا حق ہے۔''

''نہیں...، میرا حق!''

... دونوں بلیاں روٹی پر اپنا اپنا حق جتانے کے لیے پھر لڑنے کے موڈ میں آگئیں۔ بندر نے بلیوں کو نہایت متانت سے بالکل ایک تجربہ کار نیتا کی طرح سمجھایا۔ ''پیاری بہنو! سمجھداری سے کام لو، ایک روٹی کے لیے اتنا مت لڑو کہ زخمی ہو جاؤ۔ لڑائی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ میں تمھارا سچا ہمدرد ہوں، تمھارا خیر خواہ، تمھیں لڑتا ہوا دیکھ کر میری روح بے چین ہوگئی، میں تڑپ گیا، کیونکہ جھگڑا، فساد، خون خرابا مجھے قطعاً پسند نہیں ہے اس لیے میں آم کے پیڑ سے نیچے اتر کر تمھارے پاس آیا ہوں۔ تمھارا انصاف کرنے...'' بندر کچھ توقف کے بعد سانس لے کر بولا ''مجھے انصاف کرنے دو میری پیاری بہنو! لڑائی مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''تم ہمارا انصاف کس طرح کرو گے۔'' سفید بلی نے پوچھا۔

''دیکھو بہنو...! روٹی ایک ہے اور تم دو، میں روٹی کے دو برابر حصے کرکے تمھیں دے دوں گا۔''

''ہاں...، یہ ٹھیک ہے، مگر حصے برابر ہونے چاہئیں... ہاں!'' کالی بلی تحکمانہ لہجے میں بندر سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں بھئی...، یہ تو میرا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

بندر نے روٹی اٹھائی اور اپنے بزرگ کی طرح روٹی کے اس طرح دو ٹکڑے کیے کہ ایک ٹکرا بڑا دوسرا چھوٹا ہو گیا۔

بندر روٹی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے دیکھ کر بولا ''میری بہنو! روٹی کے ٹکڑے بڑے چھوٹے ہوگئے... چچ چچ یہ انصاف نہیں ہے۔'' بندر نے افسوس کا اظہار کیا اور پھر بلیوں سے مخاطب ہوا۔ ''روٹی کے ان ٹکڑوں کو برابر کرنے کا ایک حل ہے۔''

''کیسا حل؟'' سفید بلی نے پوچھا۔

''میں روٹی کے بڑے ٹکڑے سے تھوڑا کھالیتا ہوں۔'' بندر بلیوں سے بولا۔

''ہاں— کھالو بندر بھائی؟!'' کالی بلی چہکی۔

''ہاں... ہاں کھالو'' سفید بلی نے حامی بھری۔

بندر نے روٹی کے بڑے ٹکڑے میں سے اتنا کھالیا کہ وہ ٹکڑا چھوٹے ٹکڑے سے چھوٹا ہوگیا۔

''ارے! میں غلطی سے زیادہ کھا گیا۔'' بندر روٹی کے دونوں ٹکڑوں کا معائنہ کرتے ہوئے بولا ''کوئی بات نہیں بندر بھائی! تم اب بڑے ٹکڑے میں سے تھوڑا کھالو۔'' سفید بلی نے کہا۔

''ہاں...، ہمیں کوئی اعتراض نہیں بندر بھیا! ہمیں تو انصاف چاہیے— بس انصاف۔''

''تم اطمینان رکھو سمجھدار بلیو! میں تمھارے ساتھ انصاف ہی کروں گا۔''

بلیاں اطمینان سے بیٹھ کر بندر کو دیکھنے لگیں...

بندر اپنے دونوں ہاتھوں میں روٹی کے ٹکڑے لیے کھاتا رہا... وہ کھاتے کھاتے روٹی کے ٹکڑوں کو دیکھتا بھی جاتا تھا...

بالآخر جب بندر نے ساری روٹی کھالی تب بلیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خوش ہونے لگیں۔

بندر کے پیٹ میں روٹی پہنچتے ہی اسے چکر آنے لگے۔ اس کا جی متلانے لگا... بندر کو ایسا لگنے لگا جیسے اس کا معدہ آگ سے بھر گیا ہو۔ پھر اس کے پیٹ میں ایسی اینٹھن ہونے لگی جیسے کوئی اندر ہی اندر اس کی آنتوں پر نشتر چلا رہا ہو۔

بندر نے پیٹ کو پکڑ لیا— اس کے پیٹ میں درد بڑھنے لگا۔ وہ درد کی شدت سے زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا...

بلیاں اس کے گرد خوشی سے ناچنے لگیں ''کیوں بندر میاں، اب آیا مزہ انصاف کرنے کا، انصاف کے نام پر جس طرح تم ہم بلیوں کو دھوکا دیتے رہے تھے، آج خود دھوکا کھا گئے، ہمیں یقین تھا تم ہمیں لڑتا دیکھ کر انصاف کا ناٹک رچانے ضرور آؤ گے اور ساری روٹی خود ہڑپ کر جاؤ گے، ہم دونوں بہنیں بھی یہی چاہتی تھیں کیونکہ آم کے پیڑ کے مالک نے پیڑ کے موکھے میں رہنے والے چوہوں کے لیے روٹی کو زہر لگا کر رکھ دیا تھا— کیوں...؟ اب کیسی رہی؟

■

Mohd Tarique
Indamdar House
Post: Kholapur
Distt: Amravati - 444802 (Maharashtra)
Mob.: 8055503366

جوابات

(19) رشتے دار کون؟

دادا

■

ماخذ: اردو زبان کا جادو (پارٹ 1)، ادارہ، سنہ اشاعت: تیسری طباعت 2009، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

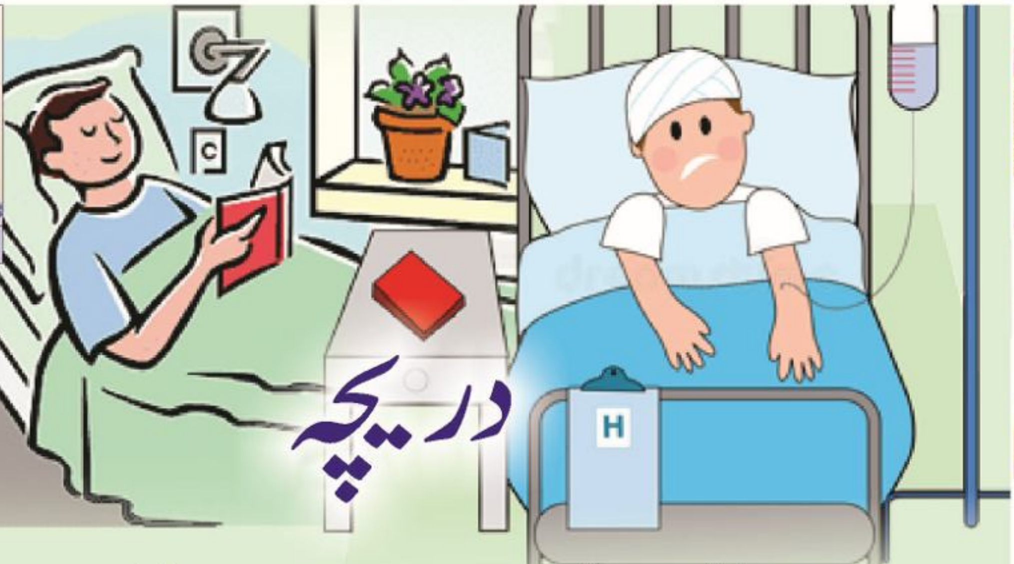

دریچہ

پرویز احمد

ہارٹ لائن ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں شکیل صاحب اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہے ہیں۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ خوش مزاج شخصیت کے مالک ہیں۔ انھیں کتابیں پڑھنے اور باتیں کرنے کا شوق ہے۔ دن بھر میں صرف ایک گھنٹہ اٹھ کر بیٹھنے کی اجازت ملتی ہے تو کھڑکی سے باہر کے نظارے کر لیتے ہیں۔ اسی وارڈ میں حمید صاحب بھی ایڈمٹ ہیں جنھیں بستر سے اٹھنے کی بالکل بھی اجازت نہیں۔ وہ چوبیس گھنٹہ اپنے بستر پر ہی لیٹے رہتے ہیں۔ انھیں بھی باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔

خاندان کی باتیں، زندگی کے گزرے یادگار لمحے اور احساس، ملازمت کے قصّے ایک دوسرے سے شیئر کرنا اب یہی ان کا مشغلہ ہے۔ دوپہر کے بعد شکیل صاحب کو اجازت ملتی ہے اٹھ کر بیٹھنے کی۔ وہ کھڑکی سے باہر کے نظارے بیان کرتے ہیں اور حمید صاحب اس سے محظوظ ہوکر اس ایک گھنٹے میں اپنی اس دن کی زندگی جی لیتے ہیں۔

''وہ دیکھو ہمارے محلے کا موہن جا رہا ہے۔''

''میں ایک زمانے سے اسے دیکھ رہا ہوں وہی پرانا رکشہ، پتلون کا ایک پانچہ اوپر اور ایک نیچے، گلے میں رومال ڈالے، سواری سے باتیں کرتا چلا جا رہا۔'' شکیل صاحب نے خوش کن انداز میں کہا۔

''اچھا۔'' حمید صاحب نے دلچسپی سے کہا۔

''ایک ماسٹرنی ہے پرائمری اسکول کی، وہی اس کی پرمانٹ سواری ہے۔''

''آج تو موہن کا چھوٹا بیٹا سنتوش بھی اس کے ساتھ ہے۔''

''گلے میں اسکول کا بستہ اور پانی کی بوتل لٹکائے۔ کتنا خوش ہے وہ۔'' شکیل صاحب نے کہا۔

''اچھا اور کیا کیا نظر آ رہا ہے تمھاری کھڑکی میں؟'' حمید صاحب نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

''کھلی ہوئی دھوپ ہے، سفید بادلوں کے بڑے بڑے تودے دوڑ کے مقابلے میں شامل ہیں، ہوا خوشی کے نغمے گنگنا رہی ہے۔ دو چار بچے اسکول سے گھر کی جانب رواں ہیں۔'' شکیل صاحب نے افسانوی انداز میں موسم کا حال سنایا۔

''واہ کیا نظارہ ہے صاحب۔'' حمید صاحب نے بند آنکھوں سے تصور کرتے ہوئے کہا۔

''چلو چاچا جی! اب دوا کا ٹائم ہوگیا۔'' نرس نے دوا

آگے بڑھاتے ہوئے شکیل صاحب کو مخاطب کیا۔

''ابھی انجکشن بھی لگانا ہے۔ پھر آرام کر لیجیے۔'' نرس نے کہا اور چلی گئی۔

شام کے کھانے کے وقت حمید صاحب کا بیٹا طفیل، بہو اور پوتا سونو بھی ہسپتال میں آئے۔

''دادا جان! آج تو ہم نے آئس کریم کھائی۔'' سونو نے کہا۔

''اچھا اور اسکول؟'' حمید صاحب نے پوچھا۔

''اسکول بھی گئے تھے۔''

''وہ شوبی ہے نا اس نے ہماری کتاب چھین لی تھی۔ پھر مس نے اسے مارا۔'' سونو نے خوشی سے بتایا۔ وہ ابھی نرسری میں زیرِ تعلیم ہے۔

''اچھا کل پھر آنا۔''

''میرے لیے آئس کریم بھی لانا۔'' حمید صاحب نے کہا۔

''اچھا بابو جی اب ہم لوگ چلتے ہیں، صبح آفس جا کر دوپہر کی فلائٹ سے ممبئی جانا ہے۔ آفس کا کچھ کام ہے۔ دو تین روز میں لوٹوں گا۔'' طفیل نے کہا۔

''اچھا بیٹا۔'' حمید صاحب نے کہا۔

بیٹا بہو کے جانے کے بعد حمید صاحب سونے کی کوشش میں لگے رہے لیکن نیند ابھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور شکیل صاحب نیند کی آغوش میں مست تھے کیوں کہ نرس نے انھیں نیند کا انجکشن لگایا تھا۔

''صاحب! کل رات میرا بیٹا بہو اور پوتا آئے تھے۔'' حمید صاحب نے بخوشی بتایا۔

''اچھا۔'' شکیل صاحب نے کہا۔

''ہاں۔ آج طفیل ممبئی جا رہا ہے۔ بڑا بزی رہتا ہے دفتر کے کام میں۔''

''ذرا فرصت نہیں رہتی۔ گھر میں بھی رہے تو بس کام اور کام۔''

''لیپ ٹاپ ہی اس کا ساتھی ہے جس سے وہ دفتر کے علاوہ بھی کام میں لگا رہتا ہے۔'' حمید صاحب نے بتایا۔

''ہاں آج کل کے بچے مشین جیسے ہو گئے ہیں۔ دفتر کے علاوہ گھر میں بھی بس کام ہی کام۔ کبھی کبھی تو لیپ ٹاپ کھانے کی میز پر بھی ساتھ ہوتا ہے۔'' شکیل صاحب نے تائید کی۔

''انجینیئرنگ کی پڑھائی کے بعد بہت پریشان تھا کہ خدا جانے کہاں جاب ملے۔''

''لیکن ایک سال کے بعد ہی اسے اچھی کمپنی کا آفر مل گیا۔'' حمید صاحب نے بتایا۔

''دوسرے شہر میں ٹریننگ کے بعد اسسٹنٹ انجینیئر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔''

''دو تین دنوں کی چھٹیوں میں کبھی کبھار آجاتا تھا۔ اکثر ٹیلی فون پر بات ہو جاتی تھی۔''

''بڑا محنتی بچہ ہے اور اسی کا صلہ اسے مل رہا ہے۔''

''اب تو اپنے شہر کے پاس کی برانچ میں اس کی تقرری ہو گئی ہے۔ اب ہم ساتھ ہی رہتے ہیں۔'' حمید صاحب نے مزید کہا۔

''اچھا ہے! بچہ اپنے شہر میں ہے۔''

''ساتھ میں رہتا ہے، اور کیا چاہیے۔'' شکیل صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''چلو چاچا جی! اب دوا کا وقت ہو گیا۔''

''یہ گولیاں کھا لو اور آرام کرو پھر دوپہر میں باتیں کرنا۔'' مسکراتے ہوئے نرس نے کہا۔

''لو آ گئی باتوں کی دشمن۔ لا کھلا دے گولیاں اور کرنے

دے آرام۔'' شکیل صاحب نے جواب دیا۔

گولی کھا کر لیٹے اور بات کرتے کرتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے شکیل صاحب۔ حمید صاحب بھی لیٹے لیٹے چھت کو گھورتے رہے۔ چھت پر بنے ایک ایک نقش و نگار کو بغور دیکھ کر انہیں ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش میں محو ہو گئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ جیسے تیسے دو گھنٹے گزر گئے۔

''ارمیلا بائی! ذرا ڈیٹول ڈال کر فرش صاف کرنا۔ اس کی خوشبو کمرہ کو فریش رکھتی ہے۔''

''چاچا جی کو بھی ڈیٹول کی خوشبو بہت پسند ہے۔'' نرس نے ارمیلا بائی سے کہا۔

چہل پہل کی آواز سن کر شکیل صاحب کی نیند کھل گئی۔

''کیا وقت ہو گیا؟ حمید صاحب۔''

''سوا دو بجے ہیں۔ اب آپ اٹھیں تو کھانا کھایا جائے۔''

''آپ آرام سے سوتے رہے اور میں چھت کے نقش و نگار میں الجھا رہا۔''

''یہ تو زیادتی ہے آپ کی۔'' حمید صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی چلو جلدی کھانا کھاتے ہیں۔ پھر کھڑکی بھی انتظار کر رہی ہے۔''

''دیکھتے ہیں آج کیا نظارہ ہمارا منتظر ہے۔''

''مادھوری! چلو جلدی سے کھانا لگا دو۔''

'' پھر بہت ساری باتیں بھی کرنی ہے ہم لوگوں کو۔'' شکیل صاحب نے نرس سے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بس ابھی حاضر ہے آپ دونوں کے لئے کھانا۔'' نرس نے جواباً کہا اور چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر شکیل صاحب نے کھڑکی کھلوائی۔ قریب جا کر ہوا کے رخ کو محسوس کرنے لگے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ قدرے اطمینان کے بعد نرس سے کہا '' اب تم جا سکتی ہو۔''

''جی چاچا جی!'' نرس نے کہا مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ حمید صاحب بھی اطمینان سے لیٹ گئے۔

''آج تو دھوپ بڑی تیز ہے۔''

''راستے میں سوائے دو تین گائے بیلوں کے اور کوئی نہیں ہے۔''

''وہ سامنے رام لعل کا بنگلہ ہے نا، وہاں آم کا بڑا سا درخت ہے اور کچھ بچے وہاں نظر آ رہے ہیں۔''

''سامنے کھنڈر نما مکان سے اینٹ کے ٹکڑے لا کر آم کے درخت پر برسا رہے ہیں۔''

''حمید صاحب کچھ یاد آ رہا ہے.....''

''آپ کے بچپن کے دن۔''

''ہم لوگ بھی ایسے ہی ادھم مچایا کرتے تھے۔'' شکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آم کے مزے الگ۔ راہ گیروں کو پتھر لگتے تھے وہ الگ۔ محلے کے لوگوں کی ڈانٹ ڈپٹ الگ۔''

''کیا مزے کے دن تھے۔ مجھے تو ان بچوں کے ساتھ جا کر آم توڑ کر کھانے کا دل کر رہا ہے۔'' شکیل صاحب کا لہجہ بڑا ہی پر شوق تھا۔

''ارے! یہ کیا؟'' شکیل صاحب نے کھڑکی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو سامنے انا جی بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں کوئی پڑیا ہے۔ اس میں ناشتہ ہو گا شاید۔''

''اپنے زمانے کے اچھے والی بال کھلاڑی تھے۔ دراز قد و قامت کے مالک ہیں۔ آج بھی ان جیسی قامت مشکل

سے ہی ملتی ہے۔''

''ان کا تعلق شہر کے کاروباری خاندان سے ہے۔''

''ان کے دو بھائی اور تھے جو اپنا آبائی کاروبار سنبھالتے تھے۔''

''کھیتی باڑی، اناج کی دکان، عالی شان مکان غرض کہ آرام کی زندگی تھی ان کی۔''

''انا جی والی بال کھلاڑی ہونے کی وجہ سے اپنی ٹیم کے ساتھ ادھر ادھر دورے پر رہتے تھے۔''

''باوا جی کے اچانک گزر جانے کے بعد کیوں کہ انا جی کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ بھائیوں کے رحم و کرم پر پلتے رہے۔ گھر کی ناچاقی کی وجہ سے وہ اکثر پریشان رہتے اور انھیں پریشانیوں کے سبب ان کا دماغ پھر گیا۔''

''پھر کیا تھا دن بھر میلے کچیلے کپڑوں میں مارے مارے پھرنا اور شام کو تھک ہار کر گھر جانا۔''

''کوئی پرسان حال نہیں ہے ان کا۔''

''اب تو پتہ نہیں گھر بھی جاتے ہیں کہ نہیں۔''

''بھوک لگی تو گلی محلے کے لوگ، دکان دار کچھ کھلا دیتے ہیں۔'' شکیل صاحب نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''ایک مزے کی بات یہ ہے کہ وہ آدمی بڑا ہنداس قسم کا ہے۔''

''اکثر نوجوان لڑکے انھیں بلا کر خطوط لکھواتے ہیں۔''

''آپ صرف نام بتا دو اور کام بتا دو اور لیٹر تیار۔''

شام کے وقت نیند پوری ہوئی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی شکیل صاحب کی۔ کچھ الجھے الجھے سے، بکھرے بکھرے سے نظر آ رہے تھے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو، سفر کی تھکان ان کے چہرے سے صاف نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' حمید صاحب نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''بس، نہ جانے کیوں تھکن سی لگ رہی ہے۔'' شکیل صاحب نے کمزور لہجے میں کہا۔

''نرس بھی پوچھ کر گئی ہے۔'' حمید صاحب نے بتایا۔

''اچھا! بلاؤ اسے، اس سے بھی کچھ باتیں کر لیں۔ ورنہ آپ سے شکایت کرے گی۔'' شکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسے ہو چاچا جی!'' مادھوری نے آتے ہی پوچھا۔

''اب تم ہی آلہ لگاؤ اور بتاؤ کتنی سانسیں بچی ہیں، کتنی دھڑکنیں بچی ہیں۔'' شکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ میں کیا بتا سکتی ہوں۔'' مادھوری نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ پھر انجکشن لگوا کر آرام کریں۔ آج آپ ذرا سست نظر آ رہے ہو۔'' مادھوری نے کہا اور چلی گئی۔

رات کے کھانے کے بعد مادھوری نے سختی سے آرام کی تاکید کی۔ دونوں مریضوں کو اپنے ہاتھوں سے دوا دے کر وہ بھی فارغ ہو گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مادھوری نے دعا کی درخواست کی اور الوداع کہہ کر چلی گئی۔

''آج تو مجھے سونو کی بڑی یاد آ رہی ہے۔''

''میرے لیے آئس کریم لانے والا تھا وہ۔'' حمید صاحب نے کہا۔

''آ جائے گا۔ طفیل کے آنے کے بعد ضرور آئے گا۔''

''آئس کریم میں آدھا حصہ میرا بھی ہوگا۔'' شکیل صاحب

نے شرط رکھی۔

''ہاں ہاں، ضرور۔ دوستی میں تو یہ ضروری ہے۔'' حمید صاحب نے وعدہ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

''چلو بھئی حمید صاحب! اب ہمیں تو نیند ستانے لگی ہے، کمبخت مادھوری نے نیند کی دوا جو دے دی ہے۔''

''آپ بھی جلدی سو جانا۔''

''اور ہاں اطمینان کی نیند سونا۔ یہ نہیں کہ آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھو۔''

''یار زندہ، صحبت باقی۔''شکیل صاحب نے الوداعیہ انداز میں کہا۔لائٹ بند کی اور بستر پر دراز ہوگئے۔

کچھ ہی دیر میں دونوں مریض گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔رات کے تیسرے پہر کا وقت ہوگا شکیل صاحب کو ہلکی کھانسی شروع ہوگئی اور وہ بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ سانس لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔سانس اکھڑنے لگی یہاں تک کہ ان کی سانس رک گئی۔کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

''چاچا جی! صبح ہوگئی۔''اگلی صبح نرس نے آ کے دونوں کو جگایا۔

حمید صاحب جاگ گئے۔لیکن شکیل صاحب موت کی نیند سوتے رہے۔پورے ہسپتال میں اک ہنگامہ سا مچ گیا۔

شکیل صاحب کے مردہ جسم کو اسپیشل وارڈ سے باہر لے جایا گیا۔تجہیز و تکفین کے لیے باہر سے کچھ لوگ آئے اور تدفین کے لیے لے گئے۔دن بھر ہسپتال کے ماحول پر سکوت طاری رہا۔حمید صاحب اور مادھوری خاموش بت بنے رہے۔

کمرے کی صفائی کردی گئی۔حمید صاحب اکیلے چھت کے نقوش میں کھوئے ہوئے تھے۔

''چاچا جی! آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔''مادھوری نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔اور سنو! ایک کام کرو، میرا بستر شکیل صاحب کی پلنگ پر لگا دو۔''حمید صاحب نے التماس کی جو قبول کرلی گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد حمید صاحب کو نئے بیڈ پر منتقل کردیا گیا۔ مادھوری نے دوا دی، آرام کرنے کی تاکید کی، لائٹ بند کی اور دروازہ آہستہ سے بند کرکے اپنے کیبن کی طرف چلی گئی۔

حمید صاحب چھت کے نقش و نگار سے باہر نکلے اب ان کی دلچسپی کھڑکی سے باہر کے نظاروں سے محظوظ ہونے میں تھی۔کچھ دیر بعد آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ہمت کرکے کھڑکی کھولی۔بڑی مشکل سے سر اٹھا کر باہر دیکھا تو ایک بڑی سی دیوار کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔اس دیوار کو دیکھ کر وہ حیرت سے ساکت ہوگئے۔

''شکیل صاحب نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا وہ ذاتی طور سے مطمئن رہنے کی کوشش کرتے رہے؟''

''کیا وہ اس طرح کی کہانیاں بنا کر خود کو اور ساتھیوں کو بہلانے کی کوشش میں لگے رہے؟''

''کیا زندگی میں خوش رہنے کے لیے ہر حال میں مطمئن اور خوش رہنا چاہیے۔''

''ہاں۔ یہ ایک پیغام تھا جسے وہ پہنچانا چاہتے تھے،اور وہ کامیاب رہے۔'' حمید صاحب کی مسکراہٹ میں مکمل اطمینان تھا۔

■

Parvez Ahmed
Peeli Haveli Chowk
Kamptee - 441001
Nagpur (Maharashtra)
MOB.: 959 555 9073

کہانی

اندھیروں کا چراغ

سمیہ فرحین علی احمد

سمیہ فرحین بچوں کی ادیبہ ہیں۔ انھوں نے پونے سے بی اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں لی ہیں اور بچوں کے لیے لکھنا ان کا شوق رہا ہے۔ بچوں کے لیے ان کی پانچ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں بیٹی ہوتو ایسی، دوستی ہو تو ایسی، مکار ملکہ، علم کی جیت، شیشے کی شہزادی بہت مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات و رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

عرشیان بہت زیادہ خوش تھا کیونکہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ وہ اسکول سے واپس گھر جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے۔ اس لیے کہ ہر سال عرشیان کے والدین سالگرہ کے دن اسے سرپرائز گفٹ دیتے تھے۔ عرشیان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اتنا زیادہ لاڈ و پیار ملنے کے باوجود وہ ذرا بھی مغرور نہیں تھا، بلکہ بہت زیادہ سمجھدار تھا۔ اس کے والدین نے اس کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔

عرشیان اپنی شاندار سی گاڑی میں بیٹھا کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسی وقت گاڑی سے عجیب سی آواز آنے لگی۔ ڈرائیور نے جلدی سے ایک کنارے گاڑی کھڑی کر دی۔ عرشیان اور ڈرائیور گاڑی سے باہر آ گئے۔ ڈرائیور گاڑی دیکھنے لگا۔ عرشیان نے کہا ”خان بابا! کیا ہوا!؟“

”بیٹا! لگتا ہے کہ گاڑی کے انجن میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے۔ ایسا کرو تم اس درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں میکانک کو لے کر آتا ہوں۔ یہاں پاس میں ہی گیرج ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ آپ جلدی آئیے گا۔“

پھر عرشیان درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہ کافی بھیڑ والا علاقہ تھا۔ سڑک کے اس پار اسکول کی بہت بڑی عمارت تھی۔ سڑک پر بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ اسکول کے میدان کے باہر ٹھیلہ گاڑی والے کھڑے تھے۔ ایک آدمی اپنی گاڑی پر

بہت سارے رنگ برنگے غبارے فروخت کر رہا تھا۔ گاڑی کے پاس بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ عرشیان مسکراتا ہوا ان بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس کی نظر پاس کھڑے ایک معصوم بچے پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بچہ حسرت بھری نگاہوں سے غبارے دیکھ رہا تھا۔ عرشیان کو اس بچے پر بہت پیار آیا۔ وہ اس بچے کے پاس چلا گیا اور کہا ''اچھے بچے! کیا ہوا، آپ اتنے اداس کیوں ہو؟''

''مجھے غبارہ لینا ہے۔''

''تو لے لو، اس میں اتنے اداس ہونے کی کیا بات ہے۔''

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ابا بہت بیمار ہیں۔ اماں نے کہا ہے کہ بعد میں لے لینا۔''

عرشیان کو اس بچے پر بہت پیار آیا۔ اس نے کہا ''اچھا چلو پہلے تم رونا بند کرو۔ تمھارے لیے میں غبارہ لے کر آتا ہوں۔'' عرشیان نے بچے کو غبارہ لا کر دے دیا۔ بچہ بہت خوش ہو گیا۔ پھر وہ غبارے سے کھیلنے لگا۔

''اسکول جاتے ہو؟''

''نہیں میں اسکول نہیں جاتا۔ لیکن مجھے اسکول جانا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں یہاں اسکول کے پاس آتا ہوں۔ مجھے اسکول جانے والے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' عرشیان بہت دکھی ہو گیا۔ اتنے میں ڈرائیور میکانک کو لے کر آ گیا۔ میکانک گاڑی بنانے لگا۔

''بیٹا تمھارا گھر کہاں ہے؟''

''یہاں پاس میں ہی میرا گھر ہے۔''

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام عادل ہے۔''

''عادل! تم مجھے اپنا گھر دکھانے لے چلو۔''

''اچھا چلو۔''

''خان بابا! آپ گاڑی ٹھیک کروائیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

پھر وہ عادل کے ساتھ اس کا گھر دیکھنے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد عادل نے ایک پرانے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہ میرا گھر ہے۔''

عرشیان نے دیکھا وہ ایک کچی بستی کا علاقہ تھا۔ وہاں صفائی کا فقدان تھا۔ سڑک بھی ٹھیک نہیں تھی۔ عرشیان نے کہا ''اچھا چلو اب تم اپنے گھر جاؤ۔ میں پھر تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔'' بچے نے خوش ہو کر کہا ''بھیا! پکا آپ آؤ گے نا؟''

''ہاں میں ضرور آؤں گا۔''

عرشیان گاڑی کے پاس آیا تو گاڑی بن چکی تھی۔

وہ خان بابا کے ساتھ اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا مگر واپسی میں وہ بہت اداس تھا۔

***

عرشیان گھر آیا تو حیران رہ گیا! کیونکہ سارا گھر پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اس کے امی ابو بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی اس کے ابو رضوان صاحب کی نظر اپنے

لاڈلے بیٹے پر پڑی وہ بہت خوش ہو گئے۔ آگے بڑھ کر انھوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو گلے لگا لیا۔ اس کی امی فاطمہ نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ عرشیان مسکرا دیا۔ پھر امی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور کہا ''تم خاموشی سے چلو۔'' پھر لان میں لا کر پٹی کھول دی۔ عرشیان نے دیکھا لان میں بہت خوبصورت سی سائیکل کھڑی تھی۔ رضوان صاحب نے کہا ''بیٹے! یہ تمھاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔'' اس نے اپنے والدین کا شکریہ ادا کیا مگر اس کے ذہن میں ایک بار پھر عادل کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں آ گئی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رضوان صاحب نے گھبرا کر کہا ''بیٹے! آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' تب عرشیان نے ساری باتیں اپنے والدین سے کہہ دیں۔

''ابو! میں عادل کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اداس مت ہو۔ ہم خود عادل کے گھر چلیں گے۔ جو ہم سے ہو سکے گا، اس کے لیے کریں گے۔''

پھر شام کو عرشیان اپنے والدین کے ساتھ عادل کے گھر گیا۔ اس کے ابو نے عادل کو ڈھیر سارے کھلونے، کپڑے اور مٹھائیاں دیں۔ رضوان صاحب نے عادل کے والد کو پیسے دیے اور کہا کہ دوبارہ سے عادل کا کسی اچھے اسکول میں داخلہ کروائیں۔ اس طرح عرشیان اور عادل اچھے دوست بن گئے۔ رضوان صاحب نے عادل کی پڑھائی کا خرچ اپنے ذمہ لے لیا۔

***

سردیوں کی بہت ہی سہانی صبح تھی۔ لان میں سنہری دھوپ تھی۔ رضوان صاحب کرسی پر بیٹھے صبح کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے عزیز دوست فراز صاحب بھی بیٹھے تھے۔ چائے کے ساتھ ساتھ اخبار کی سرخیوں پر بھی نظر تھی۔ رضوان صاحب نے کہا ''پتہ ہے فراز! کبھی کبھی جو چیزیں ہم نہیں سمجھ پاتے یہ معصوم بچے ہمیں سکھا دیتے ہیں۔ ہم ہر سال سالگرہ کے موقعے پر لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ صرف اپنی خوشی کے لیے نمائش اور دکھاوا کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ہمیں ذرا خوف محسوس نہیں ہوتا کہ ایک دن ہمیں اللہ کے پاس جانا ہے۔ ہر ایک چیز کا حساب دینا ہے۔ نہ جانے اس دنیا میں کتنے بچے ہیں جو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ان کے تعلیم حاصل کرنے کے دن ہیں، بے فکری کے ان دنوں میں ان کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ بچے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ہم سالگرہ منا کر چند لمحوں کی خوشی حاصل کرتے ہیں اور لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو انھیں پیسوں سے کسی کی اندھیری زندگی میں روشنی کے چراغ جلانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اِس نیکی سے اللہ ہم سے کتنا خوش ہوگا اور نہ صرف ہماری دنیا بلکہ آخرت بھی سنور جائے گی۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ ہم کتنی غلطیاں کر رہے ہیں۔ اگر ہم غلطیوں کو سدھاریں تو نہ جانے کتنی زندگیاں سدھر جائیں۔ ان شاء اللہ ہم آج سے عہد کرتے ہیں کہ ہم ضرور کسی کی اندھیری زندگی میں روشنی کے چراغ جلائیں گے۔'' ان شاء اللہ!

پھر دونوں دوست مسکرا دیے۔

■

Sumayya Farheen Ali Ahmad
Sarvey No 157, Plot No 74 A
Muslimpura, Rabia Masjid ke Samne
Malegaon , Nasik - 423203
Mob.: 9172482551

عائشہ صدیقہ۔جی

نام کا نام اور کام کا کام

ایک جذبے نے کیا سے کیا نہ کیا۔ فضا میں ہر طرف خمار تھا۔ بارش کے ہلکے ہلکے قطرے پیدل راہ گیروں کے لیے کہیں لطف کا سامان بن رہے تھے تو کہیں مشکلوں کا سبب بھی۔

سفر سفر ہوتا ہے۔ مشکلوں اور پریشانیوں میں بھی مسافرین اور تجارت پیشہ لوگوں کے قدم رکتے نہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر رک جائیں تو دنیا کا نظام رک جائے۔ اس کے چلتے رہنے میں ہی دنیا کی خوب صورتی چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے مشکلوں سے بے خبر لوگ چل رہے تھے، موسم کے اس مزاج نے راہ گیروں کے مزاج میں بھی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ سفر کا سلسلہ تھما تو نہیں تھا، مگر اس کی رفتار میں کمی آئی تھی، لوگ رک رک کر لوگ آجا رہے تھے، بارش کے موٹے موٹے قطرے جب زمین پر پھیل گئے تو اس رفتار میں مزید کمی آ گئی تھی۔

اب راستہ لگ بھگ سنسان تھا۔ کیونکہ اسکول اور دیگر دفتر اور ملازمین کا قافلہ کوچ کر چکا تھا۔ موسم کی تبدیلی نے لوگوں کو موقع دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے کام پر پہنچ جائیں۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے بارش رکی تھی اور اکثر لوگ اپنی اپنی مصروفیت میں منہمک ہوگئے۔ تاہم سلیم چونکہ پیدل اسکول جاتا تھا اس لیے اکثر پیچھے رہ جاتا تھا اور آج بھی اکیلا تھا۔

سلیم کے ساتھی اسکول پہنچ چکے تھے۔ کلاس میں طلبہ بیٹھے تھے۔ اساتذہ تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مگر سلیم کا ایک دوست اسلم اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ بارش بھی ہوئی ہے۔ میرا دوست سلیم کہاں ہوگا۔ کیا وہ آج اسکول آئے گا یا نہیں؟ کیا بارش اور خراب موسم نے اس کی ہمت پست تو نہیں کردی۔ اگر وہ آرہا ہے تو راستے میں اس کو بہت پریشانی ہوگی۔ کلاس میں بیٹھا بیٹھا اس کا دوست اسلم یہی سب سوچ رہا تھا۔ وہ فکر مند تھا، اپنے دوست کے لیے۔

دوسری طرف واقعی سلیم پریشانی میں مبتلا تھا... کئی ایک پریشانی تھی، پیدل سفر، راستہ متعفن، اسکول کا سفر، کلاس کا وقت... اس لیے سلیم بھی فکر مند تھا۔

پھر بھی وہ اپنی چال سے چل رہا تھا۔ کندھے پر بیگ، ایک ہاتھ میں ٹفن اور دوسرے ہاتھ میں چھتری لیے وہ

دھیرے دھیرے اسکول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کبھی ہوا کی شرارت سے پریشان بھی ہوجاتا تھا، مگر اس پریشانی کے عالم میں بھی وہ دنیا کے پریشان لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنے اطراف بہت سے پریشان لوگوں کو دیکھا تھا۔ پھر خود اس کے گھر والوں کی حالت کہاں اچھی تھی۔ وہ کئی فکر میں ڈوبا تھا۔

اتنے میں اسے کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ خوفزدہ ہوگیا۔ لیکن پھر اسے کتّے کے کراہنے کی آواز بھی محسوس ہونے لگی۔ وہ تجسس کے ساتھ آواز کا تعاقب کرنے لگا۔ اس طرح اس کی فکر میں کئی ایک پریشانیوں نے اپنا حصہ طے کرلیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بے تکان آواز کی طرف بھاگنے لگا۔ جب وہ قریب پہنچا تو دیکھا کہ راستے کے کنارے ایک گڑھے کی کیچڑ میں ایک کتا بری طرح دھنسا ہوا ہے اور بچ نکلنے کی کوئی صورت بھی نہیں۔ کتّے کی کوشش دیکھ کر سلیم سوچنے لگا کہ گر کوئی کوشش کرے تو اس کی کوشش کامیاب ہوتی ہے۔ کتّے نے کوشش کی، اس لیے شاید خدا نے مجھے اس کی مدد کے لیے بھیج دیا ہے۔ اس کی محنت کو کامیاب بنانے کے لیے مجھے یہاں پہنچا دیا ہے۔ اس لیے مجھے کچھ کرنا چاہیے، وہ اسی پش وپیش میں مبتلا تھا اور اسے اسکول بھی تو پہنچنا تھا۔

سلیم شش وپنج میں تھا کہ کیا کیا جائے، ایک طرف اسکول میں تاخیر ہوجانے کا خدشہ تو دوسری طرف کتّے کی بے بسی پر دل پسیج رہا تھا۔ اب بارش بند ہوگئی تھی، اس نے چھتری بند کی اور قریب پڑے ہوئے لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے پر اپنا اسکول بیگ رکھا اور ٹفن بکس بھی بیگ سے لگا کر رکھ دیا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے کتّے کی مدد کی جائے۔ وہ متعدد ترکیبوں پر غور وفکر کر رہا تھا، اس لیے اس کے ذہن ودماغ میں بہت سی باتیں چل رہی تھیں۔ کتّے کو بچانے کے طریقوں پر غور وفکر کر رہا تھا۔

کتا پھر کتا تھا، سامنے جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا... ہاں، نا... ہاں، نا کے بیچ اس نے ہمت سے کتّے کی طرف قدم بڑھایا۔ شاید، کتا بھی سلیم کی نیت بھانپ رہا تھا اس لیے اس نے بھونکنا بند کردیا۔ شاید کتّے کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ اس کی کوشش کامیاب ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ سلیم سے مانوس نظر آنے لگا۔ خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ سلیم اپنے مشن میں لگ گیا۔

سلیم نے اس بے زباں جانور سے پوری ہمدردی کا برتاؤ کیا اور اپنے ہاتھ سے کتّے کے اگلے دونوں پیروں کو پکڑا اور اسے کھینچ کر کیچڑ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک طاقتور فرد کی طرح وہ اپنے کام میں لگا رہا، مگر اسکول کا طالب علم کیسے اس کام کو انجام دینے میں کامیاب ہوتا، بچہ تو بچہ ہوتا ہے۔ اکیلے کام نہیں بن رہا تھا، آنے جانے والے راہ گیر بھی سلیم اور کتّے کی پریشانی دیکھ رہے تھے مگر...

سلیم کا جذبہ صادق تھا، اس لیے خدا نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ اتنے میں ایک بائیکر نے رک کر معاملہ دریافت کیا، پر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس چکر میں اس کے کپڑے گندے ہوں مگر سلیم کا جذبہ دیکھ کر وہ بھی نرم ہوگیا اور کتّے کو نکالنے میں سلیم کی بھرپور مدد کی۔ کہتے ہیں نا کہ جب بندہ کمر کس لیتا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ کتے کے حق میں سلیم نے صدق دل سے کام کیا اور پھر اللہ نے اس مسافر کو اس کی مدد کے لیے بھیج دیا۔

سلیم اس اجنبی کو شکریہ ادا کیا، سامنے کتا بالکل خاموش دُم ہلا رہا تھا، شاید کہ یہ بھی شکریہ ادا کرنے کا ایک انداز تھا۔

سلیم گندے کپڑوں کے ساتھ تاخیر سے اسکول پہنچا، اساتذہ کو اس کا یہ حلیہ دیکھ کر حیرانی ہوئی اور وہ سلیم سے اس کیفیت

کا سبب پوچھنے لگے تو سلیم نے پوری داستان سنادی۔
اساتذہ خوش ہوئے، اس کی تعریف کی اور سلیم کے اس دردمندی کے جذبے کو کافی سراہا۔
اس کہانی نے سلیم کے تئیں اساتذہ کے نظریے کو کافی مثبت بنادیا۔ جس کے سبب اساتذہ سے لگاؤ ہوا اور رفتہ رفتہ سلیم ایک مثالی طالب علم کے روپ میں اپنے اسکول اور دوست واحباب میں جانا جانے لگا۔
سلیم کے والدین نہایت خوش تھے۔
سلیم سے دیگر طلبہ کو بھی تحریک ملی۔ اب نیکی کا جذبہ عام ہوتا گیا جس کے صدقے میں سلیم کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا گیا اور جلد ہی اپنے علاقے میں اس نے اپنی الگ شناخت بنالی۔
ایک نیکی نے دوسری نیکی کے جذبے کو روشن کیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے سلیم بڑے بڑے کاموں کا اہل ہوگیا، چراغ سے چراغ جلتے گئے۔
آج سلیم ایک اچھی ملازمت کے ساتھ، شعبۂ خدمت خلق کا بانی تھا جس سے قریب پچاس افراد جڑ چکے تھے۔ جو اپنی فرصت کے لمحات جماعت کی شکل میں انسان اور جانور سب کی مدد کے لیے نکلتے ہیں۔ اس طرح غیر سرکاری ایمبولنس، لائبریری اور مسافر خانوں کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا، جس سے ایک خلق مستفیض ہو رہی ہے۔ اپنے علاقے میں رفاہی کام اور تعاون بر نیکی کے لیے سلیم کا ادارہ محتاج تعارف نہیں۔
■

Ayesha Siddiqua.J
Research Scholar
Department of Arabic, Persian & Urdu
Madras University
Chennai- 600005 (Tamil Nadu)

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

فہیم ادیب فاروقی

جگر کی باتیں
(سائنسی کہانی)

آج صبح جب میں نیند سے بیدار ہوا تو میری نظر دیوار پر موجود ڈیجیٹل گھڑی پر پڑی۔ دیکھا کہ نو بج چکے ہیں۔ لال رنگ کے اعداد تھے جو خطرے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو دن کا بھی پتا چلا کہ آج بدھ ہے اور یہ بات تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر ہفتے بدھ کے روز اسکول شروع ہونے سے قبل سائنس کے تجربے کا وقت صبح دس بجے مقرر ہے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا اور جلدی جلدی برش کر کے منہ وغیرہ دھو کر فوراً ناشتے کے لیے ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ امی جان نے فوراً ناشتہ لگایا اور کہا...

”بیٹے کامران! جلدی جلدی کھاؤ دس بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں اور ہاں پیٹ بھر کر ناشتہ کرنا۔ کہیں تجربہ کرتے کرتے بھوک سے چکر نہ آجائے۔“

”اوکے امی جان... لیکن امی جان یہ کیا۔؟“

”بیٹے! یہ بھونی ہوئی کلیجی ہے۔ بڑی لذیذ لگتی ہے... جلدی جلدی کھاؤ۔“

”نہیں امی جان۔ میں نہیں کھاؤں گا۔“

”اوکے بیٹا... ضد مت کرو۔ دوسری سبزی کھالو۔“

میں نے فوراً دوسری سبزی کھائی اور جلدی جلدی اسکول روانہ ہو گیا۔ اسکول گھر سے بہت قریب تھا۔ میں بس دو منٹ میں اسکول پہنچ گیا۔ ندیم، رافع، سلیم، عابد اور شایان ہم سب وقت پر اسکول پہنچ گئے تھے۔ جماعت کے سب بچے تجربہ گاہ میں جمع ہو گئے اور سائنس کے استاد کا انتظار کر رہے تھے۔

السلام علیکم۔ جیسے ہی ایک رعب دار آواز سنائی دی ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلام کا جواب دے کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

”پیارے بچو! آج ہم ایک آسان عنوان (Topic) پر بات کریں گے۔“

استاد نے بلند آواز میں اعلان کیا اور ایک باکس میں

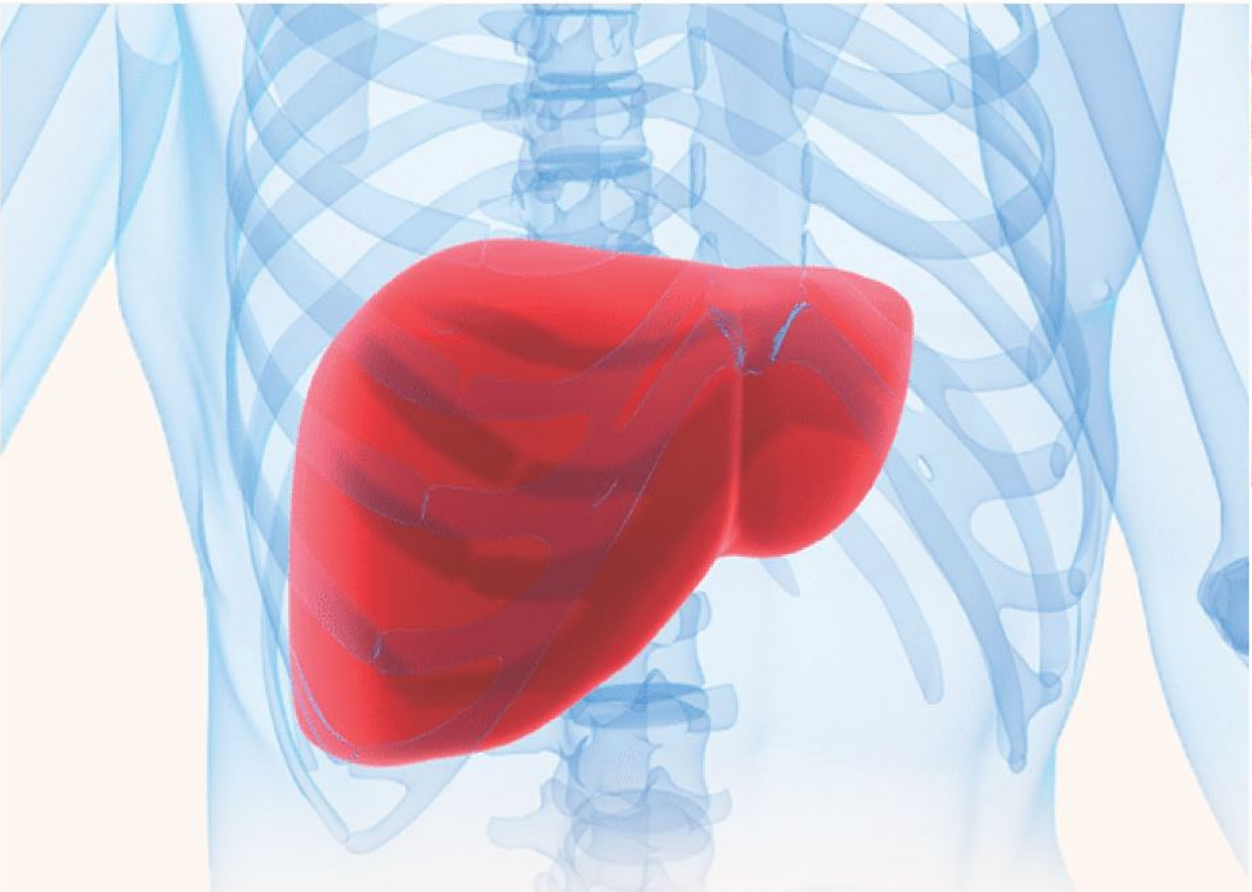

سے ایک گہرے سرخ رنگ کی چیز نکالی اور ہم سب سے سوال پوچھ لیا۔

''بچو! آپ میں سے کوئی بتا سکتا کہ یہ کیا ہے...؟''

ایک لمحہ کے لیے ہم سب خاموش ہوگئے۔ مگر کچھ وقفے کے بعد جماعت کے ہونہار طالب علم واصف نے زور سے کہا

''سر یہ کلیجی ہے کلیجی۔''

جیسے ہی استاد نے جواب سنا فوراً ہنس پڑے اور شاباشی دی۔

کلیجی سنتے ہی میری نظروں کے سامنے ناشتے والی کلیجی یاد آ گئی۔ گھر پر تو میں نے نہیں کھائی مگر یہاں تو مجھے کلیجی کو برداشت کرنا ہی تھا۔ کیونکہ جگر کی بات تھی۔

استاد نے بورڈ پر جگر (Liver) لکھا اور پھر کیا تھا ہم سب سمجھ گئے کہ آج جگر کے بارے میں جانکاری ملے گی۔ ہم سب ہاتھ باندھ کر استاد کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان کی باتیں غور سے سننے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ...

ہم سب حیوان ہیں۔ بندر، بلی، شیر، ہاتھی وغیرہ کی طرح ہمارے جسم میں بھی ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں فقاری حیوانات (Vertebrate) یعنی ریڑھ کی ہڈی والے حیوانات کہتے ہیں۔ فقری حیوانات کے جسم کے اندرونی اعضا میں سب سے بڑا عضو جگر (Liver) ہوتا ہے۔ جگر ایک بڑا غدود (Gland) بھی ہے۔

''سر یہ غدود کسے کہتے ہیں؟'' شایان نے معصومیت سے سوال پوچھا...

''بیٹے شایان غدود دراصل ایک ایسا عضو ہوتا ہے جو افراز (Secretion) کا کام کرتا ہے۔ یعنی اس سے ضروری کیمیائی مادے نکلتے ہیں جسے ہارمونز (Hormones) کہتے ہیں۔''

"جزاک اللہ سر سمجھ میں آ گیا۔"

استاد نے اچانک میری طرف دیکھا اور کہا کامران جلدی سامنے آؤ.....

مَیں گھبرا گیا۔ مجھے لگا کہ اب تو میری شامت آ گئی۔ میں گھبراتے ہوئے بورڈ کے پاس گیا۔ استاد نے کرتا اوپر اٹھانے کو کہا۔ مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی مگر استاد کے حکم کو ماننا تھا۔ میں نے کرتا اٹھایا۔ استاد نے میرے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور سب بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا.....

"دیکھو بچو! جگر پیٹ کے یہاں یعنی دائیں جانب ہوتا ہے اس کے دو حصے (گوشے) ہوتے ہیں پہلا حصہ "دایاں گوشہ" اور دوسرا حصہ "بایاں گوشہ" کہلاتا ہے۔"

میں شرماتا ہوا فوراً اپنی جگہ پر بیٹھ گیا..... سب ہنس رہے تھے۔ مگر میں دل ہی دل میں خوش ہو کر سوچ رہا تھا کہ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

اسی دوران علینا کی آواز سنائی دی۔ علینا ہماری جماعت کی ہونہار طالبہ تھی۔ اس نے اچانک ایک اہم سوال پوچھ لیا...

"سر جگر کے افعال (کام) کیا ہیں؟"

جس کے جواب میں استاد جی نے ایک لمبی تقریر کر ڈالی۔

"بیٹی علینا! جگر ہمارے جسم کا سب سے بڑا غدود ہے۔ یہ غدود ہاضمی غدود (Gland Digestive) بھی کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ کھانا ہضم کرنے کے نظام یعنی نظام انہضام (Digestive System) میں مدد کرتا ہے۔

"کیسی مدد سر...؟

ایک لمبے وقفے کے بعد میں نے اپنی خاموشی توڑی اور سوال پوچھا۔

"بیٹے کامران! جگر سے ہاضمی رس صفرہ (Juice Bile) نکلتا ہے جو ہمارے پیٹ میں داخل ہونے والی غذا کو اساسی بناتا ہے۔ اور ہاں آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جگر ہمارے جسم میں غذا میں موجود زہریلے مادوں کو صاف کرتا ہے اور ان کے زہریلے اثر کو ختم بھی کرتا ہے۔ استاد نے مصنوعی جگر کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ یہ جگر مخصوص قسم کے پروٹین بھی خارج کرتا ہے جو خون میں شامل ہوتے ہیں اور جب کبھی ہمیں زخم ہوتا ہے تو اس وقت خون کے جمنے میں یہ پروٹین مدد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جسم میں اضافی شکر (Glucose) کا بھی ذخیرہ اسی جگر میں گلائیکوجن (Glycogen) کی شکل میں ہوتا ہے۔ جو بھوک یا فاقہ کے وقت کار آمد ہوتی ہے۔"

میرے منہ سے اچانک نکلا۔ "وووووااو کتنا کار آمد عضو ہے نا جگر..... سونائس۔"

استاد نے کہا "یقیناً ہمارے جسم میں ہر ایک عضو کار آمد ہے۔ اور جگر تو بہت ہی کار آمد ہے۔ اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ جگر جسم کا وہ واحد عضو ہے جس کے خلیات اگر ٹوٹ جائیں یا ختم ہو جائیں تو وہ دوبارہ نشو و نما پاتے ہیں جسے باز پیدائش (Regeneration) کہتے ہیں۔ بچو! ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم سب جگر والے ہیں۔ اگر جگر نہ ہوتا تو سوچو کیا ہوتا۔؟

آج کا سائنس کا تجربہ اور وقت اتنے جلدی ختم ہوا کہ پتا بھی نہ چلا۔ ہم سب دوست آپس میں جگر۔ جگر کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور ہم سب اسمبلی کی تیاری میں جٹ گئے۔

■

Fahim Adib Farooqui
Farooqui Palace
318 Near Jame Masjid Ajanta-431117
Dist.: Aurangabad (Maharashtra)
Mobile No.: 9960788301

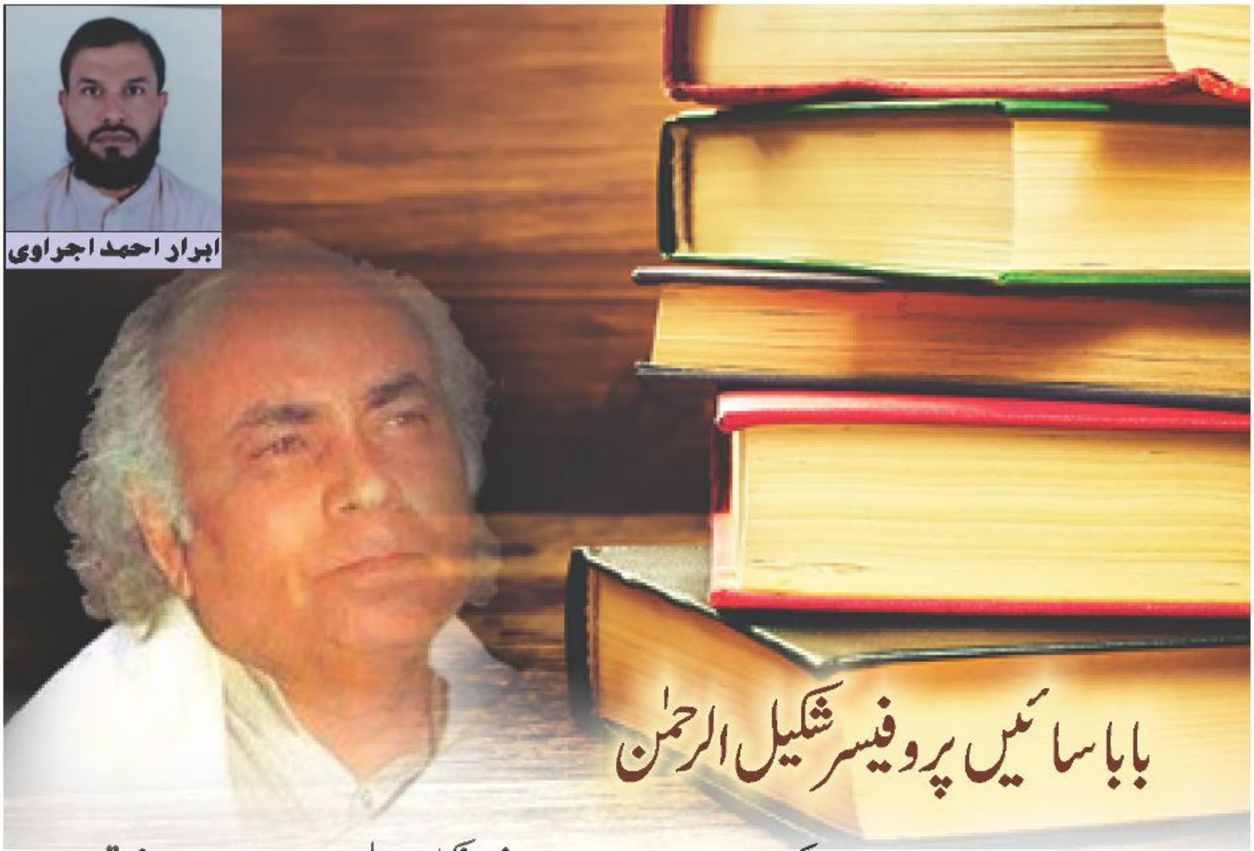

ابرار احمد اجراوی

باباسائیں پروفیسر شکیل الرحمٰن

پیارے بچو! آپ نے بچوں کا ادب لکھنے والوں میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا نام سنا ہے، مولانا حالی، علامہ اقبال، شبلی، چکبست، تلوک چند محروم، اسماعیل میرٹھی، مائل خیرآبادی، شفیع الدین نیر، منشی پریم چند، ڈاکٹر ذاکر حسین، کرشن چندر وغیرہ کے نام تو آپ کو یاد ہوں گے ہی، مگر ایک نام اب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ لوگ انھیں، استاد، ماہر تعلیم، سیاست داں، ناقد اور ادیب کی حیثیت سے تو جانتے ہیں، مگر یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ انھوں نے نو نہالان قوم و ملک کے لیے کتنا اہم اور نفع بخش ادبی سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ وہ بچوں میں اتنے مقبول تھے کہ گھر اور گھر کے باہر کے بچے انھیں پیار سے 'بابا سائیں' کے نام سے پکارتے تھے، ادبی دنیا انھیں پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نام سے جانتی تھی۔ آج ہم ان کی زندگی اور بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کہانیوں کے بارے میں بات کریں گے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن (1931-2016) مشرقی چمپارن بہار کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام خان بہادر مولوی محمد جان مرحوم تھا۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، پٹنہ یونی ورسٹی سے بی اے اور ایم اے فرسٹ کلاس کے ساتھ پاس کیا تھا۔ وہ ابتدا میں بھدرک اڑیسہ کے ڈگری کالج میں لکچرر رہے، پھر کشمیر یونی ورسٹی میں پروفیسر اور اردو شعبے کے صدر کے طور پر بھی کام کیا۔ اپنی انتظامی صلاحیت کی بنیاد پر وہ ایک نہیں، تین تین یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر بنائے گئے، ممبر پارلیمنٹ بھی رہے اور مرکزی حکومت میں کابینی وزیر بھی۔ انھوں نے جمالیات کے موضوع پر ایک درجن سے زائد کتابیں لکھیں، جن میں ہندستان کا نظام جمال، ادب اور جمالیات، میر کی جمالیات، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، ہندستانی جمالیات، اساطیر کی جمالیات، منٹو شناسی، امیر خسرو کی جمالیات، مولانا رومی کی جمالیات، جمالیات حافظ

شیرازی، محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، بارہ ماسے کی جمالیات اور کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات بہت اہم اور قابل مطالعہ کتابیں ہیں۔ آشرم ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا اور انھیں ہندو بیرون ہند سے کئی ایوارڈ اور اعزاز بھی ملے۔

انھیں اردو میں جمالیاتی تنقید کا باوا آدم کہا جاتا ہے، انھوں نے صرف جمالیات کا جھنڈا بلند نہیں کیا، بلکہ ادب اطفال کو بھی ایسا بہت کچھ دیا ہے، جو یاد رہ جانے والا ہے۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا اور ادب اطفال کی تخلیق میں جو سائنسی اور حقیقی انداز اپنایا، وہ بہتوں کے یہاں ناپید ہے۔ وہ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے بچوں میں سائیں بابا کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے 1946 میں امتیاز علی تاج کے رسالہ 'پھول' میں غور کرو بچوں کے عنوان سے تربیتی مضامین لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ بچوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ ماہ نامہ 'کھلونا' میں ان کی تحریریں بابا سائیں کے عنوان سے چھپتی تھیں۔ انھوں نے 'عمر وعیار کی واپسی' کے نام سے بچوں کا ایک ناول بھی تصنیف کیا تھا۔ بچوں کے لیے ان کے دو خوب صورت اور معلوماتی کتابچے بھی شائع ہوئے۔ ایک کا نام تھا 'بچوں کے امیر خسرو' اور دوسرا تھا 'بچوں کے کبیر'۔ ان دونوں کتابوں میں نئی نسل کو ان دو اکابر ادب کے کارناموں اور ان کے پیغام زندگی سے باخبر کرایا گیا ہے۔ اس قسم کی کوشش شکیل الرحمٰن کے علاوہ بچوں کے لیے لکھنے والے کسی دوسرے ادیب نے نہیں کی تھی۔

ان کی کہانی کی ایک اہم کتاب 'بچوں کے بابا بلھے شاہ' ہے، جو 2012 میں نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی تھی، اس کتاب کا انتساب بھی انھوں نے عرفی، عامر، جوہی اور سونو سمیت دنیا کے تمام بچوں کے نام کیا ہے۔ اس سے ان کی بچوں سے محبت اور شفقت والفت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں بابا بلھے شاہ ایک کردار ہے جو مختلف رنگ میں بچوں کو نصیحت کرتا ہے۔ اس کتاب کی ساری کہانی اسی بابا کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔ دیکھیے کہانی کا ایک اقتباس، زبان میں بہت سادگی ہے:

''بابا کے آتے ہی سب نے جھک کر سلام کیا اور انھیں چوپال کے چبوترے تک لے آئے۔ جب بابا بلھے شاہ چبوترے پر بیٹھ گئے تو گاؤں والوں نے بھی جو وہاں جمع تھے بیٹھ گئے۔ بابا نے گاؤں والوں کی خیریت دریافت کی، خوش ہوئے کہ سب ٹھیک ہے۔''

''ابھی وہ اپنی بات شروع کرنے والے تھے کہ ایک نوجوان نے کھڑے ہوکر بابا بلھے شاہ سے سوال کیا:

''بابا آپ جو یہ گاتے ہیں، اس دھرتی پر تیری سکندری، اس دھرتی پر تیری سکندری، اس کا مطلب کیا ہے؟

بابا خوش ہوئے، بولے:

''بیٹے تمھارا سوال بہت اچھا لگا، میرے اس گیت کو سب سنتے ہیں لیکن ابھی تک کسی نے اس کا مطلب پوچھا نہ تھا۔''

(بچوں کے بابا بلھے شاہ، ص 8)

'نیلی کھوپڑی' بھی پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کی بچوں کے لیے نثر میں لکھی گئی ایک اہم کہانی ہے جس میں انھوں نے ایک شریر لڑکے کی کہانی کو سبق آموز انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اتنے خوب صورت اسلوب میں کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے کہ بچے نہ صرف شوق وحیرت کے ساتھ اس کو پڑھتے ہیں بلکہ وہ خود ایک شریر بچہ بن کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کتاب کے اندرونی ورق پر جو جملے لکھے ہیں، وہ ننھے منے بچوں کا دل موہ لیتے ہیں:

''تھا تو وہ لڑکا ہی مگر شرارت میں بڑوں کے بھی کان کاٹتا ۔ اسی لیے سب اسے 'فتنہ' کہا کرتے تھے۔ اس نے کیا کیا عجیب عجیب شرارتیں کیں، کس کس طرح اپنی نوکرانیوں کو زندہ جلا دیا، لوگوں کو آپس میں لڑایا اور بہت سی دل دہلانے والی شرارتیں۔ ان شرارتوں کا پورا پورا حال پڑھو اور گھنٹوں ہنسو۔''

دیکھیے وہ کس طرح بچوں کو کہانی کے شروع میں ہی چونکاتے ہیں، تاکہ بچے سب کچھ بھول کر اس کہانی سے لطف لے سکیں:

''ڈاکٹر سرکار کی نیلی کوٹھی میں ایک نیلا صندوق تھا اور اس نیلے صندوق میں انسان کی ایک نیلی کھوپڑی تھی۔ انسان کی کھوپڑی تو سفید ہوتی ہے لیکن یہ کھوپڑی نیلی تھی۔''

(نیلی کھوپڑی، ص 3، کھلونا بک ڈپو دہلی 1956)

ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ تنویر احمد نے بھی ترتیب دے کر 'بابا سائیں کی کہانیاں' کے نام سے 2012 میں شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے 'بچوں کی نرالی دنیا' میں چھپی ہوئی ان کی کہانیوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ کہانیاں بھی بہت اہم ہیں اور اپنی سادہ زبان اور دل چسپ اسلوب تحریر کی وجہ سے بچوں میں کافی مقبول بھی ہوئیں۔ کتاب بہت مختصر ہے، مگر کہانیوں کے عنوان سے اس کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں جو کہانیاں شامل ہیں، وہ یہ ہیں۔ ایک تھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر، حضرت امیر خسرو اور بچے، آواز اذان کی، ایک کہانی شیخ سعدی کی، ملا نصر الدین ہندوستان آئے، مکھی اور مکڑا، کہانی مہاراجا رنجیت سنگھ اور فقیر عزیز الدین کی، ہمایوں اور موٹو کی کہانی، بابا گرونانک اور بچے، رام دیو جی کا کنواں، قصہ لکھن لال جی کا، ہم سب کی بڑی اماں، درخت اور ابن موسوی، کچھوا اور مینڈک، ایک تھا پیڑ، نیلی کھوپڑی کا قصہ، آبشار کے پاس ایک بزرگ، بابا سائیں چین میں، پہاڑ اور گلہری کی کہانی، ایک کہانی بہت پرانی، تاریخ کی ایک ناقابل فراموش کہانی۔ وہ اپنی کہانیوں سے بھی بچوں کو میل جول اور آپسی پیار محبت کا درس دیتے ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ بچوں کے لیے جب لکھنے بیٹھتے ہیں، تو پیچھے دوڑ کر اسی عمر میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور بچوں کی نفسیات، ان کی پسند اور ان کی ذہنی سطح کو چھونے کے بعد ہی کہانی لکھتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو کہا تھا، اس کو نافذ کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، بچوں کا ادب لکھنے والے تمام رائٹرز کو مولوی محمد حسین آزاد کا یہ قول ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ:

''جب تک آدمی خود بچہ نہ بن جائے، تب تک وہ بچوں کے لیے اچھی چیز نہیں لکھ سکتا۔''

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت اہم ہے اور اس پر ریسرچ و تحقیق ہونی چاہیے اور ان کے باقی ماندہ نثری حصے کو بھی منظر عام پر لانا چاہیے، جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کام کی شروعات کل نہیں، آج سے ہی کرنی چاہیے، تو جائیے اور ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں اپنے اسکول کی لائبریری سے تلاش کر کے پڑھیے اور اگر اینڈرائڈ موبائل چلانا جانتے ہیں تو نیٹ پر ان کی کتابوں کو سرچ کیجیے اور پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے اور انہی کی طرح سبق آموز اور دل چسپ کہانیاں اور مضامین لکھنے کی کوشش کیجیے۔

■

Abrar Ahmad
At+Po Ijra
Via Raiyam Factory
Distt Madhubani-847337 (Bihar)
M.: 9910509702

عارف عثمانی

ریگ زاروں کے گلاب

بچے قوم وملت کی امانت ہیں، اگر یہ بنتے ہیں تو قوم بنتی ہے اور یہ بگڑتے ہیں تو قوم بگڑتی ہے۔ بچوں کو سماج کا مفید عنصر بنانے کے لیے ان کی نگہداشت اور تعلیم پر توجہ دینا والدین، متعلقین اور اساتذہ کی اہم ذمے داری ہے۔

اس حقیقت سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا کہ تعلیم بچوں کے معیار زندگی اور ان کی شخصیت کو نکھارنے اور بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کے چہار طرفی نشو ونما کے لیے ضروری ہے کہ بچوں میں اخلاقی، سماجی اور ثقافتی قدروں کو پیدا کرنے کے لیے ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان قدروں کو پروان چڑھانے کے لیے بھی بھرپور توجہ دی جائے۔

اگر بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان قدروں کی تکمیل کے لیے وقت رہتے ہوئے کوشش کی جائے تو یقینی طور پر بچے سماج کے تئیں مزید کارآمد بن پائیں گے۔

بچوں کے سلسلے میں ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ بچے نقل کرنے میں ماہر ہوتے ہیں، وہ ہر اچھے برے عمل کی نقل کرتے ہیں، بس اگر اس نقلی عمل کو اچھے اور مفید کاموں کی جانب موڑ دیا جائے تو بڑے عمدہ نتائج حاصل ہوں گے۔

زیر نظر کتاب 'ریگ زاروں کے گلاب' میرے اسی خیال کی تائید کرتی ہے۔ کتاب کے مصنف برادرم منظر امین نے اس کتاب میں دنیا کی بیس نامور شخصیات کے حوصلے اور یقین کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

چونکہ احسن صاحب کا تعلق ایک مشہور و معروف اسکول سے ہے اور ان کا تعلیم و تعلم سے گہرا رشتہ ہے اس لیے انھوں نے اپنے استادانہ کمال سے یہ بھی دکھایا کہ کتاب کی ترتیب اور انتخاب کے لیے انھوں نے طلبا کی پسند کا خاص خیال رکھا۔ نتیجتاً طلبا نے اپنی دلچسپی اور رجحان کے تحت عالمی اور ملکی شخصیات کا انتخاب کیا، کتاب میں کھلاڑی، فلمی اداکار، فوجی، لیڈر، سماجی کارکن، صحافی، سائنس داں، مخیّر قوم مایۂ ناز طالب علم سب ہی مزاج کے افراد اس کی زینت بن گئے۔

موصوف نے خود بھی اس حقیقت کا اظہار کیا، اور اس کتاب کے تخلیقی مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ اس کتاب کو ترتیب دینے کا مقصد نوجوان نسل کو جدوجہد کے لیے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ نامساعد حالات میں بھی کامیابی کی راہیں نکالی جانے کی جانب نشان دہی کرنا ہے۔

یہ سچائی ہے کہ عام زندگی میں جو چہرے ہمیں متاثر کرتے ہیں، اگر ان کی ابتدائی اور نجی زندگی کے بارے میں تلاش وجستجو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں کیسی کیسی تکالیف سے سامنا کیا، اور وقت نے انھیں کتنا پریشان اور حراساں کیا، لیکن ان جیالوں نے ہمت اور استقلال کا دامن نہ چھوڑا، اور ایک دن ایسا آیا جب ان کے ہاتھ ان کی منزل آگئی۔

اس کتاب کی ابتدا ایک ایسی خاتون کی کہانی سے ہوئی ہے جس کا نام لکشمی اگروال ہے۔ یہ وہ بہادر خاتون ہے جس کے چہرہ پر 15 سال کی عمر میں ہی تیزاب سے حملہ کیا گیا ہے

اور جس کا چہرہ تقریباً برباد ہوگیا، لیکن لکشمی اگروال نے نہ صرف اپنے آپ کو جینے کے لیے بے پناہ ہمت وہ حوصلہ دکھایا بلکہ اسی طرح کی دوسری خواتین کے لیے ہمت اور حوصلے کا پیغام دیا۔

ریگ زاروں کے گلاب کے صفحات پر اے۔آر۔رحمٰن کا بھی ذکر ہے، جو آج موسیقی کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔6 سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، لیکن اس باہمت بچے نے شروع سے ہی ہمت اور حوصلہ کو اپنا غلام بنالیا۔ انھوں نے طرح طرح کی مشقیں کیں، حد یہ کہ مقامی سطح پر بینڈ میں بھی شامل ہو کر جینا سیکھا۔ انھوں نے سنگیت کا دامن اتنی طاقت سے پکڑا کہ وہ آج تک اسے پکڑے ہوئے ہیں اور ملکی و عالمی طور پر اپنی ایک پہچان بنائے ہوئے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں جو اس کتاب کے تخلیقی مقصد کو اجاگر کرتی ہیں۔

'ریگ زاروں کے گلاب' ان نوجوانوں اور طلبا کے لیے ایک میل کا پتھر ہے جو اپنی زندگیوں کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے رواں دواں ہیں، یہ کتاب حوصلہ عطا کرتی ہے ان لوگوں کو جو اپنی منزل کو پانے کے لیے تگ ودو میں مصروف ہیں۔

کتاب کے مصنف منظر امن نے دنیا کے بیس ہیروں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک خوبصورت ہار بنایا ہے، جس میں ایک طرف مدر ٹریسا ہیں، تو دوسری جانب خان عبدالغفار خان، اے سمت اے پی جے عبدالکلام کے حالات زندگی ہیں تو دوسری سمت منصور علی خاں پٹودی۔ زبان سلیس اور پراثر ہے، واقعات میں تسلسل ہے، بچے اور طلبا ہی کیا بڑوں کے لیے بھی

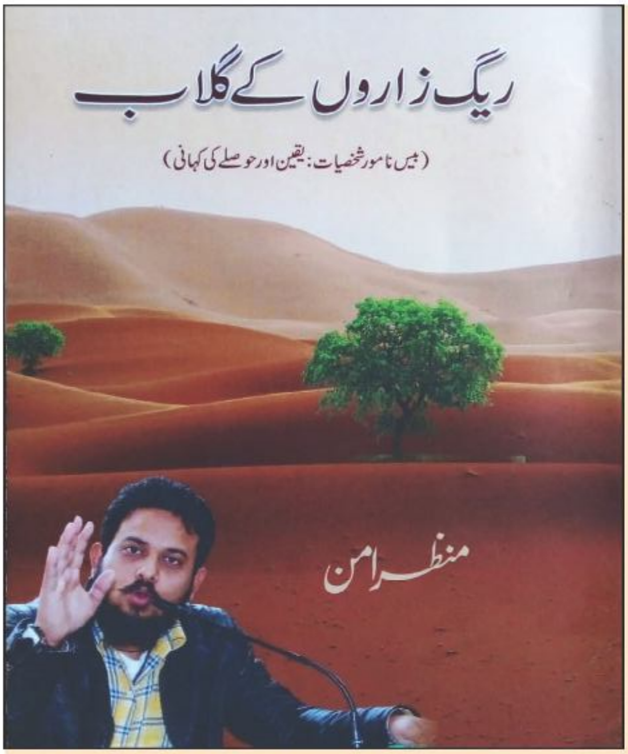

ریگ زاروں کے گلاب، مصنف: منظر امن، صفحات:84، قیمت:150 روپے

یہ مختصر مگر جامع کتاب بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔

میرے خیال میں اس کے ذریعے جو پیغام وہ خصوصاً طلبا اور نوجوانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

مصنف نے زیادہ تر کہانیوں کے آخر میں کسی مشہور شاعر کا خوبصورت شعر سے اپنے ذوقی انتخاب کو پیش کر کے اپنے مقصد کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب (ریگ زاروں کے گلاب) کا خیر مقدم کیا جائے گا، اور اسکول ضرور اسے طلبا و نوجوانوں کے لیے اپنے کتب خانے کی زینت بنائیں گے۔

■

Arif Usmani
C-5, Jasola
New Delhi - 110025